ذکاء الرحمٰن

میری لائبریری

# درد آئے گا دبے پاؤں

کہانیاں

پہلی مرتبہ میری لائبریری ہی میں

میری لائبریری میں

سفید کاغذ مجلد

# درد آئے گا دبے پاؤں

"میری لائبریری"
(۱۲۷)

# میری لائبریری میں ناول اور افسانے کی دوسری کتابیں

میدانِ عمل، پریم چند مقدمہ خواجہ محمد زکریا

فسانۂ مبتلا مولوی نذیر احمد دہلوی

میرے بھی صنم خانے قرۃ العین حیدر

مہمان بہار اشفاق احمد

پُروا بانو قدسیہ

موم کی گلیاں ؍؍

پتھر کا دیس عادل رشید

سہرے کے پھول ؍؍

آہٹیں ؍؍

بری بات ؍؍

دل بھولتا نہیں جعفر علی سید

سیماب بیگم کوثر خاں

ہیرے کا جگر عنایت اللہ

خدا دیکھ رہا ہے ؍؍

کرن کرن اندھیرا آغا اشرف

افق سے افق تک ؍؍

ٹھول کے بھنور ؍؍

لفنگے کی ڈائری (ڈرامہ)، کمال احمد رضوی

دغاباز کارلو گولڈونی مترجم کمال احمد رضوی

ٹاہلی دے تھلے اشفاق احمد

منزل منزل دل بھٹکے گا، عنایت اللہ

میرزا ادیب کے بہترین افسانے مرتب عرش صدیقی

ندیم کے بہترین افسانے ؍؍ مظفر علی سید

۱۹۶۳ء کے منتخب افسانے مرتب احراز نقوی

۱۹۶۴ء کے ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

۱۹۶۵ کے ؍؍ ؍؍ ؍؍

۱۹۶۶ کے ؍؍ ؍؍ ڈاکٹر وزیر آغا

زادِ راہ پریم چند، مقدمہ خواجہ زکریا

چاند روشن نہیں ہے، عبدالحمید نظامی

اُجلے پھول اشفاق احمد

فاصلے سیدہ عفرا بخاری

خوشبو کے گھاؤ نوید انجم

ادھ کھایا امرود خان فضل الرحمٰن

حریفِ آدم نصیر احمد ناصر

حماقتیں شفیق الرحمٰن

مزید حماقتیں ؍؍

لہریں ؍؍

پرواز ؍؍

# درد آئے گا دبے پاؤں

(افسانے)

ذکاء الرحمٰن

مکتبۂ میری لائبریری۔ لاہور ۲

میری لائبریری میں پہلی بار

۱۹۶۷ء

ناشر: بشیر احمد چودھری
ڈائریکٹر — میری لائبریری
لاہور ۲

طابع : مظفر پریس لاہور

مُنّے آپا کے نام

——— آپ کی موت مجھے زندگی کا مفہوم سمجھا گئی۔ لیکن میں ابھی یہ مفہوم سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

سلسلۂ میری لائبریری :

٥ — "آپ نے میری لائبریری کے قیام واستحکام سے اردو کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے، مجھے امید ہے کہ آپ اچھی کتابیں ارزاں قیمت پر مہیا کر کے یہ خدمت بدستور بجالاتے رہیں گے۔ فقط"

حمید احمد خاں

وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

٥ — "آپ عوام اور خصوصاً طلبا کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کم قیمت لیکن قابل قدر کتابوں کی اشاعت کو ہر دلعزیز اور مقبول بنانے کے لئے جس مشنری جذبے اور ذوق و شوق کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یقیناً قابل قدر ہے اور اس کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ موجود نہیں۔

آپ اور آپ کا ادارہ 'میری لائبریری' اردو زبان کے فروغ کے لئے جو کوششیں بروئے کار لا رہے ہیں ان کو اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ جاری رکھیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اگر اسی دیانت داری اور بے باکی کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہے تو وہ دن دور نہیں جب آپ ہر قسم کی تمام مشکلات پر قابو پالیں گے۔

خدا کرے اپنی جدوجہد و کاوش میں آپ عظیم کامرانیوں سے ہمکنار ہوں!

(چوہدری) محمد علی

وائس چانسلر — پشاور یونیورسٹی

# فہرست

## تمہارا بہت بہت شکریہ

- زبیدہ ہاشمی! کہ میں تمہیں اپنی اَن لکھی کہانیوں کے پلاٹ سُنا سُنا کر بور کرتا رہا اور تم مسکراتی رہیں۔
- لارڈ منور عمر! کہ تم "گارڈینیا" کی خنک فضاؤں میں، مجھے نئے نئے موضوع سجھاتے رہے۔
- مولوی مختار راؤ! کہ مجھے "عظیم ادیب" منوانے کے لئے ہارون آباد کے ہر ایرے غیرے سے اُلجھتے رہے۔
- انجم! —— کونسا گیت سنوگی انجم —— ؟

# سرحد

مروٹ اور بیکانیر کی سرحد کے قریب، شاہنو والے ٹوبے سے ذرا ادھر، گلاڑے کی کٹیاں یوں ایستادہ تھی جیسے کوئی جوگن سر جھکائے، نہ ختم ہونے والی سوچوں میں گُم ہو۔

شمال، مشرق اور جنوب میں صحرائے مروٹ کی خشک، رکڑ زمین کا ایک وسیع قطعہ پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس بے آب و گیاہ قطعے میں چند سخت جان، سُرخ صحرائی جھاڑیوں کے علاوہ، جن میں سے ہوا نوحے بکھیرتی ہوئی گذرتی تھی، اور کچھ نہ تھا۔ مغرب کی طرف زمین میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں اور یہاں کسی سخت جان صحرائی جھاڑی نے بھی اُگنے کی ہمت نہ کی تھی۔ شاہنو والے ٹوبے سے پانی کی ایک پتلی سی دھار، ایک مدقوق ندی کے روپ میں، زمین کی سیاہ سطح پر بہتی ہوئی، دور تک نکل گئی تھی۔ اس مدقوق، گدلی ندی کے کنارے

کیکر کے درختوں کی ایک چھدری سی قطار یوں لگتی تھی جیسے کسی لمبی، پرفتانی آنکھ پہ جھڑی ہوئی پلکیں سایہ فگن ہوں۔

اگر کیکر کے درختوں کی یہ چھدری سی قطار نہ ہوتی تو گلارے نے برسوں پہلے خودکشی کرلی ہوتی۔ صحرائے مروٹ کے باشندے، لکڑی کی شدید کمی کی وجہ سے، ان درختوں کے دیوانے ہوتے ہیں جو انھیں لکڑی مہیا کرسکیں۔ ٹوبہ گہرا ہو یا پایاب، پانی گدلا ہو یا صاف، اس کی انھیں پرواہ نہیں۔ ٹوبے کے کنارے یا ارگرد اگر موٹے تنوں اور توانا شاخوں والے درخت ہیں تو گویا، اپنے تئیں، وہ جنت میں رہتے ہیں۔

گلارے نے اپنی یہ کٹیا کسی کی مدد کے بغیر تعمیر کی تھی۔ جب وہ قحط کے کارن بیکانیر کی سرحد عبور کرکے، مروٹ میں ہمیشہ کے لئے آباد ہونے کا ارادہ لے کر، شاہنو والے ٹوبے کے کنارے پہنچا تھا، تو اس زمانے میں ادھر، ادھر، بیس بیس میل تک انسان کی کسی آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ یہ کبڑی کٹیا اس نے کیکر کے ٹیڑھے، میڑھے تنوں، سرکنڈوں، اور ٹوبے کی دلدلی تہہ کے گارے سے تعمیر کی تھی۔ اس کی مخروطی چھت پہ ڈالنے کے لئے، اسے کئی دنوں تک پھاوڑے سے خشک، اکڑی مٹی کھودنی پڑی تھی اور اس کی مضبوط ہتھیلیوں پر، جہاں صحرائی جھاڑیوں کے نوکیلے کانٹے بھی چبھنے کی تاب نہ رکھتے تھے، اتنے چھالے پڑ گئے تھے کہ مارے تکلیف کے اُسے کئی راتیں ستاروں کی ہمکلامی

میں بسر کرنی پڑی تھیں۔ کٹیا کے دروازے کی چوکھٹ کیکر کے ایک ایسے تنے سے بنائی گئی تھی جس کی شکل آٹھ (۸) کے ہندسے سے ملتی جلتی تھی۔ ایسا تنا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن مروٹ کے قدیم باشندوں کا یہ خیال ایمان کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور آج بھی وہ اپنے اس ایمان کو گنوانے کے لئے تیار نہیں کہ گلارا جب، اکیلا، جھونپڑی تعمیر کرتے کرتے تنگ آگیا اور چوکھٹ بنانے کے لئے اس کی ہر تجربہ ناکام ہو گئی تو اس نے غصے میں آکر کیکر کا ایک تنا اپنے گھٹنے پر رکھا اور زور لگا کر اس کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ لیا۔

چھت کے وسط میں گیدڑ کی کھالوں کا پردہ لٹکا کر جھونپڑی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصے میں چولہا تھا۔ چولہا کیا تھا، زمین کھود کر ایک گڑھا بنا لیا تھا۔ اس گڑھے میں کریر اور ون کی سوکھی جھاڑیوں کا ایک ڈھیر سردیوں، گرمیوں، ہر وقت سلگتا رہتا تھا۔ گلارا گیدڑ یا ہرن کا گوشت اسی سلگتے ہوئے الاؤ پر بھونتا تھا۔ دوسرے حصے کے ایک گوشے میں ریت کا ہموار، مستطیل ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر پر ٹوبے کے کنارے اُگنے والی، نرم گھاس بچھا دی گئی تھی۔ یہ گلارے کا بستر تھا۔ گرمیوں میں تو گلارا، جھونپڑی سے باہر ریت کے کسی ٹیلے پر سو رہتا تھا، لیکن سرما میں، جب پورے صحرا کو یخ بستہ ہوائیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھیں، گھاس اور ریت کا یہ بستر اس کی ہڈیوں کو رات بھر اتنی حرارت بخشتا رہتا کہ وہ آرام کی نیند سو سکے۔ اس بستر کی سرہانے والی

دیوار کی ایک بے ہنگم سی کھونٹی پر سانپوں کی کئی خشک کھالیں لٹکی ہوئی تھیں
یہ وہ بدنصیب سانپ تھے جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ گلارے کو دکھلائی
پڑ گئے تھے۔ گیدڑ اور ہرن کے گوشت کے بعد، سانپ گلارے کی مرغوب
غذا تھے۔ اسے سانپ پکڑنے میں اتنی مہارت تھی کہ انھیں، بغیر کسی ہتھیار کے
زندہ پکڑ لیتا تھا اور پھر ٹکڑے سے بالشت بھر سر کی جانب سے اور بالشت بھر
دُم کی طرف سے کاٹ کر، وہ درمیانی دھڑ کی کھال بڑی نفاست کے ساتھ
اتار کر، الاؤ پر بھون کر کھا جاتا تھا۔ مروٹ میں گلارا جس قبیلے کا باقی ہوا،
وہ قبیلہ آج بھی سانپ کھاتا ہے۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ سانپ کے درمیانی
دھڑ کا گوشت مچھلی کے گوشت سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

گلارے کی جھونپڑی میں سب سے حیرت ناک چیز چکنی مٹی کی ایک بڑی سی
گول رکابی تھی، جو دروازے کے سامنے والی دیوار پہ آویزاں رہتی تھی۔ یہ رکابی
بنانے سے، شاید، چکنی مٹی میں کئی رنگ بہت سلیقے سے گوندھے گئے تھے۔
اسے اگر دور سے دیکھا جائے تو یوں لگتا تھا کہ محض سجاوٹ کے لئے استعمال میں
آنے والا، ایک خوبصورت سا رنگدار پہیہ ہے، لیکن قریب سے دیکھنے پر
پتہ چلتا تھا کہ ان رنگوں سے ایک مخصوص منظر ابھارا گیا ہے ..... ایک
ٹوبہ، ٹوبے کے چاروں طرف صحرائی پھول اور ہر پھول کے عقب سے ایک
سانپ کا پھن جھانکتا ہوا ..... آج بھی گلارے کے قبیلے کے ہر فرد کی

جھونپڑی میں اس منظر والی رنگدار رکابیاں دیواروں پر آویزاں دکھلائی پڑتی ہیں۔ یہ رکابیاں کہاں سے آتی ہیں؟۔ وہ آرٹسٹ کون ہے جو ان رکابیوں کی مٹی میں اس قدر سلیقے سے رنگ گوندھتا ہے کہ محض رنگوں کے امتزاج سے ایک مخصوص منظر ابھر آئے؟ یہ باتیں اب تک ایک سربستہ راز ہیں.... گلارے کے قبیلے کے لوگ اس ایٹمی دور میں بھی مٹی کے برتنوں اور ان کے استعمال قطعی ناآشنا ہیں۔ ان کی زندگی کا ڈھرا ہی کچھ ایسا ہے کہ انھیں برتنوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ باقی رہے رنگ، تو میں کئی ماہ تک ان لوگوں کے ساتھ رہا ہوں اور پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ لوگ رنگوں کے اندھے ہیں۔ ان رکابیوں کا یہ منظر دراصل گلارے کے قبیلے کے مذہبی اعتقاد کا اظہار ہے... ڈبہ انسانی زندگی کا مظہر ہے، اس کے چاروں طرف اُگے ہوئے پھول خیر کی یا دوسرے لفظوں میں یزدان کی علامت ہیں، ان پھولوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے سانپوں کے پھن شر کی ان قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو یزدان کی حریف ہیں اور ہر اس جگہ موجود ہوتی ہیں جہاں خیر موجود....... یہ انسانی فطرت ہے کہ اس چیز یا وجود کی عبادت کی طرف راغب ہوتی ہے، جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔ چنانچہ گلارے کا قبیلہ پھولوں کی پرستش کرتا ہے۔ پھولوں کی پرستش کا یہ عقیدہ گلارا بیکانیر سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا.... مروٹ کے صحرا میں تو کہیں کہیں پھول مل جاتے ہیں، لیکن بیکانیر کا وہ علاقہ، جس کی سرحد مروٹ

سے ملتی ہے، پھولوں کے اعتبار سے بالکل بنجر ہے۔

گلارے کو بیکانیر کی سرحد پار کئے کئی ماہ گذر چکے تھے۔ شاہنو والے ٹوبے کے قریب کٹیا تعمیر ہو چکی تھی۔ اور وہ مروٹ میں موسم سرما کا پہلا دن تھا۔ گلارا، اپنے چولہے پر گیدڑ کے گوشت کے پارچے بھون رہا تھا۔ اس کا سات فٹ لمبا، مضبوط جسم چولہے پر جھکا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بیٹھے بیٹھے اپنا جسم سیدھا کیا اور بڑی کاہلی کے ساتھ مندی مندی آنکھوں سے دروازے کے باہر، اتھاہ، بھورے آسمان کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نظریں ان سُرخ، صحرائی جھاڑیوں پر تیرنے لگیں جو اس کی جھونپڑی کے سامنے دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔۔۔۔ وہ ان جھاڑیوں کی ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتّے کو جانتا تھا۔ اس نے ان جھاڑیوں کا بہاراں، بہاراں نکھار بھی دیکھا تھا اور ان کی خزاں، خزاں افسردگی سے بھی اسے آشنائی تھی۔ اس نے ان جھاڑیوں کو مروٹ کی بلاخیز گرمیوں میں جلتے ہوئے، برسات کی ٹھنڈی، ٹھنڈی پھواروں میں نہاتے ہوئے، صرصر کے ہولناک طوفانوں میں جڑوں سے اُکھڑتے ہوئے اور پھر ٹڈی دل کے حملوں کے دوران شاخ شاخ ویران ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ موسم گرما کے عروج کے دنوں میں، جب سورج زمین پر اُتر آتا ہے تو ان جھاڑیوں میں خود بخود آگ لگ جاتی

ہے اور حدِ نگاہ تک کئی جہنم جل اُٹھتے ہیں۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور بھاری بھاری قدموں سے چلتا ہوا دروازے میں آکھڑا ہوا۔ سامنے، جھاڑیوں سے پرے، کچھ فاصلے پر، ریت کے اونچے اونچے ٹیلے سرما کی دھوپ میں چاندی کے ڈھیروں کی طرح چمک رہے تھے اور ان پر ہرنوں اور ہرنیوں کی کئی ڈاریں باہم لاڈ پیار اور اچھل پھاند میں مصروف تھیں۔ چند جوڑے اختلاط کی منزل تک پہنچنے کے لئے بوس و کنار کے مرحلے طے کر رہے تھے ... معاً سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی اور وہ دروازے کو یوں عبور کرنے لگا، جیسے اس کا جسم قدموں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر رہا ہو ... مروٹ اور بیکانیر کی سرحد پر رہتے ہوئے اسے عمریں گذر گئی تھیں۔ پہلے وہ اس طرف تھا اور اب اُس طرف ... صرف چند میل کا فرق پڑا تھا ... وہ یہاں کے ہر موسم کا عادی تھا۔ لیکن سردیوں سے اس کی جان نکلتی تھی۔ اس نے اس علاقے کی کئی سردیاں دیکھی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ ان سردیوں کا مطلب کیا ہوتا ہے ... ٹھٹھری ہوئی ہڈیاں، کاہل جسم، ہر کام معطل اور چاروں طرف پھیلا ہوا ویرانی کا گہرا احساس ... مروٹ اور بیکانیر کی سرحد پہ رہنے والے سردیوں سے اسی طرح خوف کھاتے ہیں جیسے بچے رات سے اور بنگال کے باسی سائیکلون سے۔

کچھ دیر تک ادھر، ادھر گھوم کر وہ پھر جھونپڑی میں آ گیا اور غربی دیوار کے

قریب پڑا ہوا ٹکڑا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس نے ٹکوے کی نوک زمین میں گاڑ دی اور اس کی ہتھی پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔ اس وقت وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر کسی جذبے کا پرتو نہ تھا، لیکن آنکھوں میں گہری سوچ کے سائے لہرا رہے تھے، جیسے کسی اہم مسئلہ پر غور کر رہا ہو۔۔۔۔ اس کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی اور ٹکوے کو اسی جگہ رکھ کر وہ باہر نکل گیا۔

اپنی جھونپڑی سے دن میں کئی بار باہر نکلنا اور صحرا میں کہیں دور چلے جانا، اس کے لئے ایک اہم ضرورت بن کر رہ گئی تھی۔۔۔۔ اس جھونپڑی میں رہتے ہوئے اُسے کئی ماہ گذر گئے تھے۔ ہڈیوں کے اندر تک اُتر جانے والی سردی، بدن کو جھلسا دینے والی گرمی، آنکھوں کے اندرونی پردوں کو بھی جھلسا دینے والی صرصر، ٹوبے کا گدلا پانی، یہ سب اس کا مقدر تھے۔ اور آج بھی وہاں رہنے والے ہر انسان کا مقدر ہیں۔۔۔۔ موسموں کی ناقابل برداشت سختیوں کے کارن مروٹ اور بیکانیر کی اس سرحد پر خودکشی اور پاگل پن کے واقعات عام ہیں۔ جب صحرا کی کوکھ سے جھلتی بگولے اُٹھتے ہیں یا شمال کی اور سے منجمد کرنے والی ہوائیں آتی ہیں تو ریت کے کسی ٹیلے پر، کسی ٹوبے کے کنارے، کسی جھاڑی کے سائے میں ایک، دو بے گور و کفن انسانی لاشیں اپنی زندگیوں پر نوحہ کناں دکھلائی پڑ جاتی ہیں۔۔۔۔ ممکن ہے، مروٹ اور بیکانیر کی اس سرحد پر آنے والی نسلیں راحت آشنا ہوں۔ ان کی زندگیاں اتنی کٹھن نہ ہوں مگر یہ نسل قدرت کے بے لگام عناصر کی

چکی میں بُری طرح پس رہی ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ وقفۂ ماتم ہے۔ اس کے ذہنوں میں مبہوت خیالوں کی تلواریں ہیں، جو ہمہ وقت دل و جگر کاٹتی رہتی ہیں۔ اس کی سانسوں میں صحرا کی آگ ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں وحشت ہے پاگل پن ہے۔

گلا رے کے ذہن میں بھی دل و جگر کاٹنے والی مبہوت خیالوں کی تلواریں تھیں، سانسوں میں صحرا کی آگ تھی، آنکھوں میں وحشت تھی، پاگل پن تھا لیکن اس کی وحشت اور پاگل پن اس درجے تک نہ پہنچا تھا کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس نے کیکر کی چھال اور ون کی جڑوں سے تیار کردہ تند شراب پینی شروع کر دی تھی۔ ٹوبے کے شمالی کنارے سے ذرا پرے، اکڑ زمین میں، اس نے ایک گڑھا کھود رکھا تھا۔ یہ گڑھا شراب کی بھٹی کا کام بھی دیتا تھا اور ساغر و مینا کا بھی۔ گرما کے آغاز میں وہ اس گڑھے کو ٹوبے کے پانی سے لبالب بھر دیتا تھا اور پھر اس پانی میں کیکر کی چھال اور ون کی جڑیں ڈال کر اس کو سرکنڈوں سے ڈھانپ دیتا تھا۔ تین، چار مہینوں کے بعد کھولتا تو شراب تیار ہوتی اور وہ دن میں جب جی چاہتا، اوک میں بھر بھر کر چڑھا جاتا..... جب وہ بیکانیر میں تھا تو اسے شراب کی عادت نہ تھی۔ لیکن جب وہاں قحط کے عفریت نے اپنے خوفناک جبڑے کھولے اور اس کے تمام عزیز و اقربا ان جبڑوں کی خوراک بن گئے اور اسے ہجرت کر کے امروٹ آنا پڑا تو یہاں نہ ختم ہونے والی تنہائی میں، اُکتا دینے والے اکیلے پن میں اسے شراب کے علاوہ اور کوئی ساتھی نہ بلا۔

اس دخترِ رز کی صحبت اسے کچھ ایسی راس آئی کہ جب تک دن اور رات میں کئی بار اس کے لب نہ چوم لیتا، اسے اپنی زندگی ادھوری، ادھوری محسوس ہوتی۔ وہ ایک عظیم جثے والا شخص تھا اور فطری طور پر اس میں مدافعت کی بے پناہ قوت تھی۔ اس لئے بعض اوقات وہ تند شراب کا آدھے سے زیادہ گرہ بھی پی جاتا، تب کہیں جا کر اس پر پورا نشہ طاری ہوتا۔ اور جب سرور کی لہریں دماغ کے ان خلیوں تک پہنچتیں، جن کا تعلق حواس سے ہے تو وہ اپنے تکیے کو سرہانے رکھ کر بستر پر لیٹ جاتا اور اپنی اُلجھی ہوئی داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرنے لگتا، آنکھیں دروازے سے باہر جھانکتی رہتیں اور اسی عالم میں اسے نیند آجاتی۔

شراب مختلف آدمیوں پر مختلف اثرات مرتب کرتی ہے اور اس کا سرور انسان کی چھپی ہوئی فطرت کو باہر لے آتا ہے۔ . . . . ایک بیوقوف آدمی شراب پی کر رونے لگتا ہے۔ کوئی کٹھور دل پی لے تو اس میں شیطنت جاگ اٹھتی ہے۔ کسی کم حیثیت کے حلق میں اُتر جائے تو وہ ذلیل اور گھٹیا حرکتوں پر اُتر آتا ہے۔ لیکن گلاڑ پیتا تھا تو اُداس ہو جاتا تھا اور اس کے ذہن میں دلگیر اندھیرے پھیل جاتے تھے۔ اور جب وہ سرور و بے خودی کے عالم میں اپنے سات فٹ لمبے بستر پر لیٹتا تو زندگی کی تمام مشکلات، تمام خوف اور تمام کٹھنائیاں، اس کے ٹھٹھرے اور سکڑے ہوئے محسوسات پر برسنے لگتی تھیں۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جو راحت اور خوشی کا نام تک نہ جانتا تھا۔ اس کی زندگی ایک مسلسل مشقت تھی۔ . . . . تنہائیوں اور مشکلوں

کے ہجوم میں گھری ہوئی مشقت . . . . ایک ایسے فرہاد کی مشقت، جس کا پھاوڑا دُودھ کی کوئی نہر نہیں جاری کر سکتا تھا . . . . وہ رنگ دار رکابی ہمیشہ اس کی نظروں کے سامنے رہتی تھی جس پر اُبھرے ہوئے پھولوں کے عقب سے سانپوں کے پھن بھی جھانکتے تھے۔

اور جب ایک قبیلہ بیکانیر کے قحط سے بچ بچا کر، سرحد پار کر کے، مردوت کے علاقے میں، شاہنو والے ٹوبے کے پانچ میل مشرق میں، سرکنڈوں کے جھنڈ کے قریب ایک چھوٹے سے ٹوبے کے کنارے آباد ہُوا تو ہمسائے ملنے کی خوشی میں گلارا اُچھل پڑا۔ اور اسے اپنی اتھاہ تنہائیاں سمٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ لیکن اتنا عرصہ اکیلا رہنے کی وجہ سے گلارے کی معاشرتی حس قدرے مرجھا گئی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے نئے ہمسائے بیکانیر کے علاقے میں گلارے کا شہرہ سُن چکے تھے اور اس کی بے پناہ طاقت، عظیم جثے، خوش طبیعت اور جھکی ہوئی، گھنی پلکوں سے خوف کھاتے تھے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ لوگ اس کے قریب آتے، اس سے دور، دور رہنے لگے۔ اور گلارا ان کے لئے کئی پردوں میں چھپا ہوا ایک بھید اور دلوں کو لرزانے والی ایک دہشت بن کر رہ گیا۔ وہ ایک دوسرے کو اس کے جثے، طاقت اور شراب کی عجیب و غریب، خوفناک کہانیاں سنانے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک رات، شراب کے نشے میں دھت، گلارا گیدڑ کے شکار کے لئے صحرا میں نکلا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور اس کی آنکھیں

پپلوؤں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ راستے میں کریر کی ایک بڑی سی جھاڑی میں ایک صحرائی نیل گائے چھپی کھڑی تھی۔ گلارا نشے میں اس جھاڑی میں جا اُلجھا۔ خوفزدہ نیل گائے نے گھبرا کر ایک ایسی بھرپور دولتی جھاڑی کہ اس کے دونوں کُھر گلارے کے ماتھے پر لگے اور خون بہہ نکلا۔ گلارا ایک لمحے کے لئے تو لڑکھڑا گیا لیکن پھر سنبھل کر اس نے نیل گائے کی پچھلی ٹانگیں پکڑ لیں اور انھیں اپنے سینے کے ساتھ سختی سے بھینچ لیا۔ اب نیل گائے ٹانگیں چھڑاتی تھی اور گلارا چھوڑتا نہ تھا۔ یوں رات بھر حیوانی طاقت انسانی طاقت سے نبرد آزما رہی۔ اور جب اگلے دن قبیلے کا ایک کمسن لڑکا جنتی اتفاق سے اس راہ سے گذرا تو اس نے یہ منظر دیکھا کہ گلارا، بڑے اطمینان سے، نیل گائے کی پچھلی ٹانگیں اپنے سینے کے ساتھ بھینچے پڑا سو رہا تھا، نیل گائے اپنی اگلی ٹانگوں پر جُھکی ہوئی تھی اور مارے خوف کے اس کا پورا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے تیز ہوا میں سوکھا پتّا کانپتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس واقعے کے بعد صحرائے مروٹ میں پھر کبھی کوئی نیل گائے نہیں دیکھی گئی . . . . گلارے کے بارے میں یہ کہانی آج بھی مروٹ کے ویرانوں میں گونجتی ہے اور وہاں کی مائیں اپنے بچوں کو گلارے کے نام سے ڈراتی ہیں۔

چنانچہ اس قبیلے کی آمد بھی گلارے کی تنہائیوں کو ختم نہ کر سکی۔ وہ اسی طرح اکیلا، اکیلا رہا اور اس کی دماغی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی۔

صحرائے مروت میں موسم بہار یوں آتا ہے، جیسے گھٹا ٹوپ رات میں بجلی کا کوندا لپکے اور غائب ہو جائے۔ بہار کا یہ مختصر سا وقفہ ہی اپنے ساتھ ایسے چند لمحے لاتا ہے جب مروت کے باسیوں کو عشق لڑانے، گیت گانے، رقص کرنے اور پرانی اور نئی دشمنیاں چکانے کی فرصت نصیب ہوتی ہے۔۔۔ ایسے ہی ایک موسم بہار کی دلنوازسی صبح کا ذکر ہے کہ اس قبیلے کے دو خاندان کسی پرانے جھگڑے کی بنا پر باہم ٹکرا گئے۔۔۔ ٹکوؤں کی دھاریں تیز ہوئیں، سر پھٹے، ماتھے زخمی ہوئے اور صحرائی بہار کی رعنائیوں میں انسانی خون کی مہک رچ گئی۔۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے ایک خاندان قبیلے سے الگ ہو کر شاہنو والے ٹبے کے شمال میں ایک اور چھوٹے سے ٹوبے کے کنارے آبسا۔۔۔ یہ ٹوبہ شاہنو والے ٹوبے سے چند گز کے فاصلے پر تھا اور اس کے کناروں پر کریہ کے گھنے جھنڈ تھے۔

اس خاندان نے کنارے کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا اور اس کی گمبھیر تنہائیاں میٹھی، میٹھی ہلچل سے آشنا ہو گئیں۔

یہ خاندان تین افراد پر مشتمل تھا۔۔۔ بڈھا یاسن، اس کی بیوی گوتی اور ان کی نوجوان بیٹی شالی۔۔۔۔ یاسن ہر وقت اتنی شراب پیئے رہتا کہ کسی سے محبت کرنے یا خوف کھانے کی اسے ہوش ہی نہیں ہوتی تھی۔ گوتی اس قدر بانولی

اور گپ شپ کی اتنی رسیا تھی کہ اس چسکے کی تسکین کے لئے وہ آدمی تو رہا ایک طرف، بھوت سے بھی ملاقات کرنے کو تیار رہتی تھی۔ اور شاید عمر کے اس دَور میں تھی، جب جوانی کی بدمستیاں کسی خوف کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ گلارے کی ہیبت ناک شخصیت کی دھاک، کچھ تو اپنی افتاد طبائع کی وجہ سے، ان پر پہلے ہی کم تھی اور جو تھوڑی بہت تھی وہ قبیلے سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ گلارے کو ان سے میل جول بڑھانے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ سرِ شام ہی وہ ان کے ٹوبے پر چلا جاتا، وہ اور یاسن مل کر شراب پیتے۔ یاسن بلانوش اور کم گو آدمی تھا۔ شراب جونہی اس کے دماغ کو چڑھتی، وہ اتنا غفیل ہو جاتا۔ گوتی پہلے ہی موقع کی تاک میں ہوتی۔ یاسن کے دھت ہوتے ہی وہ گلارے کے پاس آ بیٹھتی اور پھر باتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا کہ رات ڈھلنے پر بھی ٹوٹنے میں نہ آتا۔

دن گذرتے رہے۔ بیکانیر میں قحط کی ہولناکیاں اتنی بڑھ گئیں کہ انسان تو انسان، ہرن، گیدڑ اور دوسرے صحرائی جانور بھی سرحد عبور کر کے، قافلہ در قافلہ مروٹ کی حدود میں داخل ہونے لگے۔ بیکانیر میں تین برس سے بارش نہیں ہوئی تھی، ٹوبوں کا پانی سوکھ گیا تھا اور درختوں اور جھاڑیوں کی جڑیں تک خشک ہو گئی تھیں۔

اس اثنا میں کئی قبیلے ہجرت کر کے مروٹ میں آ چکے تھے۔ شاہ ہنو والے

ٹوبے کے آس پاس ان قبیلوں نے کئی ڈھوکیں آباد کر لی تھیں اور وہ علاقہ جو صدیوں سے سنسان پڑا تھا، انسان کی آوازوں سے گونجنے لگا تھا۔

وہ ٹوبہ جس کے کنارے چند ماہ پیشتر صرف یاسن، اس کی بیوی اور بیٹی نے ایک جھونپڑی تعمیر کی تھی، اب کئی جھونپڑیوں سے گھر گیا تھا۔ وہاں دو قبیلے اور آباد ہو گئے تھے۔ انھوں نے اس ٹوبے کو شاہنو والے ٹوبے سے زیادہ وسیع کر لیا تھا اور یاسن چونکہ اس ٹوبے کا پہلا آباد کار تھا، اس لئے اس کا نام یاسن والا ٹوبہ مشہور ہو گیا تھا اور اس کے کنارے ابھرنے والی جھونپڑیوں کی یہ آبادی یاسن ڈھوک کے نام سے موسوم ہو گئی تھی۔ یاسن ڈھوک نے ایک اکائی کی صورت اختیار کر لی تھی اور یاسن کا خاندان بھی، اپنے آبائی قبیلے کو بھلا کر اس اکائی میں گم ہو گیا تھا۔

گلارا بدستور یاسن کے ہاں آتا تھا، شراب اڑتی تھی اور رات ڈھلنے تک گپ شپ کی پھلجھڑیاں چھوٹتی تھیں۔

ہوتے ہوتے پوری یاسن ڈھوک میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ گلارا یاسن کی بیٹی اشالی، پر عاشق ہے اور اس سے شادی کرنے والا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ڈھوک کی تمام نوخیز لڑکیاں شالی کو گلارے کا نام لے لے کر چھیڑتیں اور کہتیں کہ یہ بڈھا گیدڑ پہلی رات ہی تیرا انجر پنجر ڈھیلا کر دے گا۔ اس پر شالی انھیں فحش گالیاں بکنے لگتی۔

اس میں شک نہیں کہ گلارا شالی پر عاشق تھا۔ لیکن اس نے آج تک کبھی شالی سے براہ راست گفتگو نہ کی تھی اور نہ کبھی تنہائی میں اس سے ملا تھا۔ وہ آتا تو خاموشی سے یاسن کے ساتھ شراب پیتا یا اس کی بیوی سے گپیں ہانکتا اور کبھی کبھی چور نظروں سے شالی کو دیکھ لیتا۔ اس منزل سے آگے اس نے کبھی قدم نہ بڑھایا۔ بس یہی چور نظریں تھیں جن کو شالی کی شریر سہیلیوں نے بھانپ لیا تھا اور اس کے عشق کا راز پوری ڈھوک میں پھیل گیا تھا۔

ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ لوگوں نے پَر کے کوّے بنا لئے اور ڈھوک کے وہ نوجوان جو مدّت دراز سے خوابوں کے آسمان پر من چلے پتنگوں کی طرح، شالی کی جوانی کے بلند پرواز پرندے کے پیچھے ڈول رہے تھے، رقابت کی آگ میں جلنے لگے۔ ایک دن کسی منچلے نے، سرِ عام، گلارے پر بڈھی گھوڑی لال لگام کی پھبتی کس دی۔ بس پھر کیا تھا۔ گلارے کا پُرانا وحشی پن عود کر آیا، اور اس نے اس منچلے کو سر سے اوپر اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ وہ موت سے تو بچ گیا، لیکن ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ ساری عمر کے لئے چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ آئندہ کے لئے لڑکوں کے تو کان ہو گئے مگر شالی گلارے سے بدظن ہو گئی۔ جس بات کو وہ اب تک شریر سہیلیوں کا مذاق سمجھی تھی، اس واقعے نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ اس کی مغرور جوانی نے پھن اٹھایا اور پھنکار، پھنکار کر کہا، میں البیلی ناگن، میں کسی بڈھے سانپ کی آغوش

گرم نہ کر دوں گی، یہ میرے جوان خون کی بہت بڑی توہین ہے۔ چنانچہ اس نے ڈھوک کے ایک پھرتیلے جسم والے گبھرو سے پینگیں بڑھالیں۔۔۔ اس گبھرو کا نام میرن تھا اور گیدڑ اور ہرن کا شکار کرنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

میرن اور شالی کی راہ و رسم کچھ ہی دنوں میں اس درجے تک پہنچ گئی کہ وہ صحرا کے تنہا، تنہا گوشوں میں چھپ چھپ کر ملنے لگے اور میٹھی، میٹھی سرگوشیوں کے درمیان انھوں نے ہمیشہ کے لئے ایک ہو جانے کے وعدے کر لئے۔ مگر جب بوڑھی چور نظریں نہ چھپ سکیں تو جوان سرگوشیوں کو پھیلنے سے کون روک سکتا تھا؟۔

شالی کی اس بے رُخی، بلکہ انتقامی کارروائی سے، لگا رے کے دل پر بڑے کاری زخم لگے تھے۔ اس کی تنہائیاں اور خاموشیاں لوٹ آئی تھیں اور اس کی پوری زندگی میں یہ پہلا مرحلہ آیا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو مجبور اور بے بس سمجھا تھا۔ اس نے تمام عمر موسم کی سختیوں اور زندگی کی مشقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گذاری تھی، لیکن عورت کی ستم رانیوں سے اسے پہلی مرتبہ واسطہ پڑا تھا۔ اس سے پہلے اسے معلوم ہی نہ تھا کہ من چاہی عورت کا حصول، گیدڑ اور ہرن کے شکار سے زیادہ محنت طلب اور زیادہ مشکل ہے۔ وہ جب جوان ہوا تھا اور اس کے جسم نے عورت کی ضرورت محسوس کی تھی، تو عزیز و اقربا نے خود بخود اس کے تنہا تنہا لمحوں کی عماری میں تنی ہوئی چھاتیوں والے ایک آبنوسی بدن کو دھکیل دیا تھا۔۔۔ وہ تنی ہوئی چھاتیوں والا، آبنوسی جسم اس کے جسم کی پکار کا جواب تھا اور شالی

اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی صدا تھی..... جسم کی پکار کے جواب کو بیکانیر کا قحط چاٹ گیا تھا اور دل کی صدا نے ایک عزیز جوانی سے ناطہ جوڑ لیا اور خنجر بن کر خود دل پر بڑے کاری گھاؤ لگائے...... اس نے یاسن ڈھوک آنا ترک کر دیا تھا۔ وہ سارا سارا دن اپنی جھونپڑی میں بند پڑا رہتا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اکیلے میں وہ کیا کرتا ہے اور کیا سوچتا ہے۔ مگر یاسن ڈھوک کے لوگوں کو یقین تھا کہ گلارے کے ہاتھوں میرن موت کے گھاٹ اترے گا یا شالی کی خیر نہیں۔

یہ باتیں شالی کی ماں گوتی کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں..... ایک شام وہ گیدڑ کا گوشت بھون رہی تھی کہ اس نے گنگناتی ہوئی شالی سے کہا۔

"امبڑی کپتی تھیوے[1]! اس بھین یار میرن کے ساتھ تیرے تعلقات کہیں تیرا انجام بد نہ کر دیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی آدمی ہیں جن کے ساتھ تو شادی کر سکتی ہے۔"

شالی نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا اور چلچلا کر بولی،

"میں کسی زال سڑے[2] سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ باقی رہا میرن تو جب تک اس کا جسم پھرتیلا ہے اور جب تک وہ ایک دن میں کئی گیدڑ شکار کر سکتا ہے، میں اس کے ساتھ سوتی رہوں گی۔ معلوم ہے جب میرن کے ساتھ میرا تعلق نہیں تھا

---

[1] امبڑی کپتی تھیوے...... ماں مر جائے، ماں قربان ہو۔ مروٹ کے لوگوں کا عام تکیہ کلام۔

[2] زال سڑا...... عورت کا دیوانہ، عورت کے پیچھے پیچھے پھرنے والا، زن مرید۔

تو ہمیں گیدڑ اور ہرن کا شکار کرنے میں کتنی مشکل پیش آتی تھی؟۔ کئی راتیں ایسی گذریں کہ ہمیں بھوکا سونا پڑتا۔ بابا کو تو دارو نے ناکارہ کر دیا ہے۔ وہ شکار کرنے جاتا ہی نہیں۔ اور اب ہمیں، بغیر کسی مشکل کے، بیٹھے بٹھائے، ہر روز ایک ہرن یا گیدڑ مل جاتا ہے۔"

"یہ تو تیری بات ٹھیک ہے۔ مگر تو جو شادی کے بغیر میرن کے ساتھ سوتی ہے، تیرے اگر بچے ہو گئے تو کیا کرے گی؟۔ کون سنبھالے گا انہیں۔ پہلے ہی کھانے کو نہیں ملتا۔ ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی تو بالکل بھوکے مر جائیں گے۔ بیکانیر میں شیبی کا انجام پتہ ہے کیا ہوا تھا۔ ٹوبے میں ڈوب کر مر گئی تھی۔ اور پھر گلارے کو تو اچھی طرح جانتی ہے..... وہ ضد میں آ کر ہم سب کی ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہے۔"

گلارے کے ذکر پر شالی بھنا گئی۔

"بس رہنے دے امبڑی، اپنے گلارے کو۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ سارے بیکانیر اور مروٹ کی طاقت اسی میں آ گئی ہے اور نہ..... بھلین....."

اور گالی ابھی شالی کے منہ میں ہی تھی کہ گلارا جھونپڑی کی چوکھٹ میں نمودار ہوا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں، لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔

شالی کی ماں کا دل اچھل، اچھل کر حلق میں آنے لگا اور اس کا رنگ لیکیے پھولوں کا ایسا زرد پڑ گیا۔ اور گیدڑ کا گوشت بھونتے بھونتے اس کے ہاتھ کانپنے لگے، مگر اس نے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کی اور کہنے لگی،

"آ بھیٔ گلارے، تینڈی جندڑی دل دل وِدھی تھیوے، تونے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ میں سمجھی پتہ نہیں کون ہے... یاسن پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے ... ابھی تو یہیں تھا... پر تو وہاں کیوں کھڑا ہے.... اندر آکر بیٹھ جانا۔"

گلارا، اسی طرح خاموش اور شانت، اندر آکر گوتی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر شالی کو نہ دیکھا.... اس کے سخت اور کھردرے بال اُلجھے ہوئے تھے اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے کالے ہرن کی کھال کا کُرتہ پہن رکھا تھا اور اس کی داڑھی میں شاہنو والے ٹوبے کے کناروں پر اُگنے والی نرم گھاس کی پتلی، پتلی، خشک ڈنٹھلیں اُلجھی ہوئی تھیں.... وہ شاید آج کئی روز کے بعد بستر سے اٹھا تھا۔ شالی اس کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر ہولے ہولے ہنسنے لگی.... گلارے کی ماتھے کی سلوٹیں گہری ہو گئیں۔ لیکن اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔

اتنے میں، کہیں سے، یاسن بھی شراب کے نشے میں دھت، جھومتا جھامتا، آ گیا۔ اسے دیکھ کر گلارا اُٹھ کھڑا ہوا۔ یاسن نشے میں واہی تباہی بک رہا تھا۔ گلارے نے اس کا بازو تھام لیا اور پُرسکون لہجے میں کہنے لگا،

"یاسن، سنو، میں آج اس لئے آیا ہوں کہ تم مجھ سے اپنی بیٹی کی شادی کر دو۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا، شالی کو میں آج ہی اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"آج ہی؟" یاسن نے ہچکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، میں کل یا پرسوں تک انتظار نہیں کر سکتا۔ میں اکیلا رہتے رہتے تنگ آ گیا ہوں۔"

یاسن اپنے لرزتے ہوئے جسم کو سنبھال کر دھاڑا،

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ایک شرابی کے ساتھ اپنی بیٹی کو چلتا کر دوں گا۔ اس آدمی کے ساتھ جو سانپ کھاتا ہے، کچی دارو پیتا ہے..... باہر ہو میرے گھر سے، ورنہ مار مار کر نکال دوں گا..... تیری زال کو پاڑتاں[1]، باہر ہو۔"

یہ کہہ کر یاسن ہچکیاں لیتا ہوا، لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

گلارے نے یاسن کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی پرسکون انداز میں شالی کی طرف بڑھا اور اس کے چہرے پر ایک بھی نظر ڈالے بغیر اس کا گداز بازو اپنی مضبوط انگلیوں میں جکڑ کر کہنے لگا،

"یہاں سے جو کچھ لینا ہو لے لے اور چل میرے ساتھ۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ بابا کی طرح آج تو نے بھی کچھ زیادہ دارو پی لی ہے..... تیرا دماغ تو ٹھکانے ہے بڈھڑے؟"

"اگر تو خود نہیں چلے گی تو میں اٹھا کر لے جاؤں گا..... بہتر یہی ہے کہ چپ چاپ میرے ساتھ چلی آ۔" گلارے کا لہجہ ویسا ہی شانت اور پرسکون تھا۔

---

[1] تیری زال کو پاڑتاں..... تیری عورت کے ساتھ برا فعل کر دوں۔ (گالی)

شالی نے قریب پڑی ہوئی لاٹھی، گلارے کو مارنے کے لئے اٹھالی۔ لیکن گلارے نے اس کی کلائی پکڑلی اور پھر لپک اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر، اسے اپنے کندھے پر اٹھالیا۔۔۔۔ شالی اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے پاگلوں کی طرح ہاتھ پیر مار رہی تھی چیخ رہی تھی، گالیاں بک رہی تھی۔ پاسو زمین پر پڑا ہچکیاں لیتا رہا، گوتی چولھے کے قریب بیٹھی بین کرتی رہی، اپنا سر پیٹتی رہی اور گلارا شالی کو اپنے کندھے پر اٹھائے، جھونپڑی سے نکل گیا۔

آہستہ آہستہ شالی کا سارا جوش وخروش ختم ہوگیا اور اس نے اپنے آپ کو گلارے کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ پاسو کی ہچکیاں اور گوتی کے بین دور ہوتے گئے اور شالی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا۔ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ گلارا اُسے کہاں لئے جارہا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ لٹک کر گلارے کی توانا چھاتی پر جھول رہا تھا اور اس کے کانوں میں ہوا ہلکی ہلکی سیٹیاں بجارہی تھی۔

گلارا شالی کو اپنے کندھے پر سختی سے بھینچے، اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ ہوا کے دباؤ سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں اور سانس رُکا جاتا تھا۔

جب وہ اپنی کٹیا میں پہنچا تو اس نے شالی کو بڑی آہستگی سے کندھے سے اتار کر ریت اور گھاس کے بستر پر بٹھادیا۔۔۔۔ شالی کے گھنیرے بال بکھر گئے تھے اور اس کے تمتماتے ہوئے، سانولے رخساروں پر آنسوؤں کے داغ تھے اور اس کا گداز جسم، سسکیوں سے لرز رہا تھا۔۔۔۔ گلارے نے اس سے کوئی بات نہ

کی اور چُپ چاپ چولھے میں آگ سلگانے لگا۔ آگ سلگا کر وہ شالی کے قریب آ گیا اور اس کے لرزتے جسم کو وحشی آنکھوں سے گھُورنے لگا۔ پھر اس نے کھونٹی سے سانپ کی دو خشک کھالیں اُتاریں اور ان سے شالی کے ہاتھ پیر باندھ کر جھونپڑی سے باہر، شام کے گہرے دھندلکوں میں غائب ہو گیا۔

جب شالی تنہا رہ گئی تو ہوتے ہوتے اس کی سسکیاں بند ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ بھاگنے کا تصور کرنا بھی فضول تھا۔ وہ اتنی حساس نہ تھی کہ اپنے غرور کے چکنا چور ہو جانے پر آنسوؤں کی لڑیاں پروتی رہتی۔ اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ گلادے کے بس میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں بغاوت کے آخری شعلے بجھ رہے تھے اور وہ یہ سوچ سوچ کر اپنے کو تسکین دے رہی تھی کہ قصّہ تو محض سونے کا ہے، میرن کے ساتھ نہیں تو گلادے کے ساتھ سہی . . .

وہ تھک چکی تھی۔ اس کی کمر میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے از حد کاہلی کے ساتھ سر اٹھا کر جھونپڑی کے ماحول کا جائزہ لیا۔ جھونپڑی کا ماحول ایک ایسے شخص کے رہن سہن کا مکمل غمّاز تھا، جو برسوں تنہا اور اداس رہا ہو۔ شالی کے دل میں اس شخص کے لئے ہمدردی اور رحم کے جذبات پیدا ہوئے اور اس نے زیر لب اپنے آپ سے کہا،

"بے چارہ۔"

پھر اس کے خیالوں کا رُخ میرن کی طرف مڑ گیا۔

"اگر میرن کو اس تمام واقعے کا پتہ چل گیا تو وہ کیا کہے گا؟..... اونہہ... کرنا کیا تھا... بھلا اس کا اور گلارے کا کیا مقابلہ... گلارا اگر انگلی لگا دے تو زال سر قبے کی ہڈیاں بجنے لگیں۔"

لمحے تھکے تھکے انداز میں گذرتے رہے... گلارا اب تک واپس نہ آیا تھا اور شالی اکیلا پن محسوس کر رہی تھی۔ شام کے دھندلکے رات کے سایوں میں ڈھل گئے تھے۔ یہ ایک پُر اسرار اور ڈراؤنی رات تھی۔ دور کہیں گیدڑ بول رہے تھے اور فضا میں وہ حبس اور سکوت تھا جو، مروسٹ ہیں، طوفان گرد و باد کی آمد کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ تب پہلی مرتبہ اس کی نظر سانپوں کی ان خشک کھالوں پر پڑی، جو کھونٹی پر لٹک رہی تھیں۔

گلارے... گلارے۔" اس نے خوف سے لرزتے ہوئے زور زور سے پکارا۔ لیکن اس کی آواز صحرا کی بے کراں وسعتوں میں ڈوب کر رہ گئی۔

گلارے... گلارے۔" اس نے ایک بار پھر آواز دی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب چیخ چیخ کر روئے۔

معاً جھونپڑی کے باہر، بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں کے بعد گلارا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی داڑھی میں ریت کے نقرئی ذرے چمک رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟"۔ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے، روشنی کر دو۔"

گلارے نے چولھے میں مزید خشک جھاڑیاں جھونک دیں۔ آگ بھڑک اُٹھی اور جھونپڑی کی بے ہنگم دیواروں پہ روشنیاں اور سائے مل جُل کر رقص کرنے لگے ..... گلارا پھر باہر آ گیا اور، عقب میں، ریت کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دوبارہ شالی کی آواز سنی،

"اب کیا ہوا ہے تجھے؟" اس نے اندر آ کر پوچھا۔

"مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے..... اچھا میں یاسن دھوک سے تیری ماں کو بلا لاتا ہوں"۔ اور وہ جانے کے لئے اٹھا۔

"نہیں رہنے دے اسے، وہ نہیں آئے گی۔"

"آئے گی کیسے نہیں، میں لے آؤں گا۔"

"نہیں نہیں اگر وہ آ بھی گئی تو نال سڑی بین کر کر کے ناک میں دم کر دے گی۔"

"اچھا تو تیرے باپ کو بلا لاتا ہوں۔"

"نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں صرف تجھے چاہتی ہوں" اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور آواز اتنی مدھم تھی کہ گلارے کو اپنا کان، اس کے ہونٹوں کے قریب لے جانا پڑا۔

ایک لمحے کے لئے گلارا، سحر زدہ سا، خاموش کھڑا رہا۔ اور پھر اس کے حلق سے

غرغراہٹ سی نکلی...... شالی نے گھبرا کر اپنی پلکیں اوپر اٹھائیں...... گلارا، رنگدار رکابی کے سامنے، اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے، گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ اس کا سات فٹ لمبا، مضبوط جسم سسکیوں سے لرز رہا تھا اور اس کی گھنی داڑھی میں آنسوؤں کے قطرے جذب ہو رہے تھے۔

---

# ہنگامہ

گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول ہارون آباد کے ہوسٹل کا کامن روم از حد بوجھل اداس اور لاتعلق سا دکھائی پڑ رہا تھا...... بجلی کی وولٹیج حسبِ معمول کم ہو گئی تھی اور چھت کے عین درمیان لٹکتا ہوا بڑا سا بتی بلب دھندلا گیا تھا اور سارے کمرے میں مدھم سی زرد روشنی بکھر رہی تھی۔ فرش پر ایک بوسیدہ، سبز قالین بچھا ہوا تھا اور کرسیاں یوں بکھری، بکھری پڑی تھیں جیسے ترتیب اور قرینے سے کبھی آشنا ہی نہ رہی ہوں۔ دائیں کونے میں ایک چھوٹی سی بدرنگ میز پر رکھے ہوئے مٹی کے گلدان میں، بسنتی گلاب کے پھول سہم کر کمھلا گئے تھے...... اور ٹوٹے ہوئے اسپرنگوں والے، بڑے سے صوفے پر عائشہ لیٹی ہوئی تھی...... اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے چہرے کا رُخ کعبے کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ اس کی گلابی قمیص پہ کئی شکنیں پڑ گئی تھیں اور کندھے کے قریب گریبان کا ایک کُچ بٹن کھل گیا تھا...... وہ

ایک کشیدہ قامت اور بھرے بھرے جسم والی لڑکی تھی۔۔۔ پھولے، پھولے سیاہ بالوں تلے اس کا زرد، بیضوی چہرہ یوں خوابیدہ تھا جیسے بھنوروں کے جھرمٹ میں سورج مکھی کے پھول کو نیند آ گئی ہو۔۔۔ لیکن اب وہ ایک لاش تھی۔ سرد، بے جان اور پھولی ہوئی لاش۔۔۔ اور اس کی قمیص کی تنگ آستینوں میں بھنچے ہوئے گداز بازو، جو خون کے ایک، ایک قطرے سے محروم ہو چکے تھے، دیکھنے والے کو نیم برہنگی کا تاثر دیتے تھے۔۔۔ اس وقت اس نے جو یہ گلابی قمیص پہن رکھی تھی، شاید، اس کی بہترین قمیص تھی۔۔۔ کون جانے یہ قمیص بنوانے میں عائشہ کو اپنی کئی چھوٹی موٹی ضروریات قربان کرنی پڑی ہوں۔۔۔ کون جانے اس نے خاص تقریبات کے لئے، جو اس کی زندگی میں بہت کم آتی تھیں، اس قمیص کو بڑی احتیاط سے، بہت سنبھال کر رکھا ہو۔۔۔ کون جانے کہ جب اس نے پہلے جاڑے سے یہ قمیص پہنی ہو تو اس کا دل کئی بار اُچھلا ہو اور اس کے رخساروں پر کئی شرمیلے اور شوخ رنگ بکھرے ہوں۔۔۔ کون جانے کہ جب یہ قمیص اس کے قد و قامت پر پھب گئی ہو تو اس کے دل کے آئینے میں کئی محبوب چہروں کا عکس جھلملایا ہو۔۔۔ مگر اب۔۔۔ موت کے ان بے رحم، جانگداز لمحوں میں یہ قمیص اس پر ایک تہمت بن کر رہ گئی تھی۔۔۔ ایک دھوکہ۔۔۔ ایک فریب۔

روزنامہ "رہبر" بہاول پور کے نوجوان نامہ نگار نے اس سترہ سالہ لاش کا بڑے غور سے معائنہ کیا اور اپنے کو ایک بہت بڑا پاکھنڈی محسوس کیا۔۔۔ اس کے قریب

چند سہمے، سہمے لوگوں کا ایک مختصر سا ہجوم کھڑا تھا۔ وہ اکھڑی، اکھڑی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔۔۔۔ ہجوم کے عین وسط میں عائشہ کا باپ تھا۔۔۔ لمبے قد اور مضبوط جسم والا ایک کسان۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر ایک مستقل کپکپاہٹ۔۔۔۔۔ اس کے کندھے غم کے بوجھ سے جھک گئے اور وہ بار بار ململ کے صافے کی لڑ سے اپنی سرخ ناک پونچھ رہا تھا وہ ابھی ابھی تین بجے کی گاڑی سے آیا تھا تاکہ اپنی بیٹی کی لاش، کفن دفن کے لئے، واپس اپنے گاؤں لے جائے جو فقیر والی ریلوے اسٹیشن سے دو میل جنوب میں سکس۔آر (۶۔آر) نہر کے کنارے پر واقع تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں نے تو اپنی بیٹی کو گاؤں سے زندہ سلامت بھیجا تھا اور گھی کا ایک ٹین بھی اس کے ساتھ کر دیا تھا تاکہ بورڈنگ میں رہتے ہوئے اسے ڈالڈا نہ کھانا پڑے۔ اب اسی ہنستی، بولتی بیٹی کی لاش اگر واپس لے کر جاؤں تو گاؤں کی ان گلیوں کو کیا جواب دوں گا جن کے پیچ و خم نے چہلوں اور قہقہوں کے درمیان اس کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔۔۔۔ وہ بھوری بھینس اپنی معصوم آنکھیں اٹھا کر پوچھے گی کہ عائشہ آئی ہے تو میرے تھنوں سے کچے دودھ کی مہکیلی دھاریں کیوں نہیں لیتی، اسے کیا جواب دوں گا۔۔۔۔ کس زبان سے اسے سمجھاؤں گا کہ عائشہ مر گئی ہے۔۔۔۔ آنسوؤں کا ایک ریلا امڈا اور اس ریلے کو روکنے کے لئے اس نے اپنی بھتیجی شرفاں بی بی سے گفتگو شروع کر دی۔۔۔۔ شرفاں بی بی عائشہ کے ساتھ اسی سکول میں پڑھتی تھی اور اسی ہوسٹل

میں رہتی تھی۔ اور کئی سال متواتر فیل ہونے کی وجہ سے عائشہ سے جونیئر تھی، حالانکہ پڑھائی اس نے عائشہ سے پہلے شروع کی تھی . . . . وہ کہہ رہی تھی کہ عائشہ اگر اسے اعتماد میں لے لیتی تو یہ دردناک واقعہ کبھی نہ ہوتا . . . . عائشہ کی تین ہم جماعت سہیلیاں گھبرا گھبرا کر کبھی عائشہ کے مردہ چہرے کو دیکھ لیتیں اور کبھی ان کی اداس نظریں عائشہ کے باپ کا طواف کرنے لگتیں اور کبھی از حد لاتعلقی کے ساتھ وہ شرفاں بی بی کی باتیں سننے لگتیں . . . . جھڑوس بالوں والی ایک استانی، ٹکٹکی لگائے پسنتی گلاب کے کھلائے ہوئے پھولوں کو دیکھے جا رہی تھی . . . . . ان سب کے چہرے پژمردہ اور سکڑے ہوئے تھے . . . . عائشہ کے باپ اور شرفاں بی بی کی سرگوشیاں بدستور جاری تھیں اور بظاہر لاش کی طرف دیکھتا ہوا نوجوان نامہ نگار، ان سرگوشیوں کو بڑے انہماک سے سننے کی کوشش کر رہا تھا اور سماعت کی گرفت میں آنے والے ایک، ایک لفظ کو اپنی یادداشت کے سرد خانے میں بڑی احتیاط سے محفوظ کرتا جا رہا تھا . . . معاً اسے طویل قامت، سادہ لوح شرفاں بی بی کا وہ بیان یاد آیا جو اس نے عائشہ کے باپ کی آمد سے پہلے، بوکھلاہٹ میں، غیر ارادی طور پر، اس کے سامنے اُگل دیا تھا،

"عائشہ نے خودکشی کی ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا عائشہ کے باپ اور شرفاں بی بی کے قریب آگیا . . .
اس مختصر سے، سوگوار ہجوم میں اس کی موجودگی کو شک و شبے کی نظر سے دیکھا جا رہا

تھا اور وہ عائشہ کی ایک سہیلی کو کئی بار اپنا شناختی کارڈ دکھا کر اپنے نامہ نگار ہونے کا یقین دلا چکا تھا۔

عائشہ کے باپ نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اسے بڑی بے بسی سے دیکھا.... وہ ان ماتمی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور عائشہ کی ایک سہیلی سے روزنامہ "رہبر" کا چند دن پرانا پرچہ لے کر پڑھنے لگا.... آخری صفحہ پر ایک چھوٹے سے چوکھٹے میں عائشہ کے بارے میں ایک خبر شائع ہوئی تھی..... یہ خبر خود اسی نے رپورٹ کی تھی..... اس کی نظریں بڑی کاہلی کے ساتھ چوکھٹے کا طواف کرنے لگیں۔

ایک کسان لڑکی کا اعزاز

ہارون آباد۔ ۱۶ر مارچ۔ معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی ایک طالبہ، عائشہ بی بی میٹرک کے امتحان میں اپنے سکول میں اول آئی ہے عائشہ بی بی ہارون آباد کے ایک نواحی قصبے، فقیر والی کے ایک ان پڑھ کسان کنبے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ سکول کے چند اچھے مقرروں میں بھی شمار ہوتی ہے۔ مزید معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے عنقریب کسی قریبی کالج میں داخلہ لے گی۔

اس کی ہم جماعت سہیلیاں اور استانیاں اس کے اعزاز میں ایک الوداعی دعوت دے رہی ہیں۔ (نامہ نگار)

خبر پڑھنے کے بعد اس نے اخبار واپس عائشہ کی سہیلی کو دے دیا اور ایک انجانے سے جذبے کے تحت سر ہلانے لگا، جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہہ نہ سکتا ہو...... سب خاموش تھے .... عائشہ کے باپ اور شرفاں بی بی کی سرگوشیاں بھی ملتوی ہو گئی تھیں ..... کوئی ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ دراصل ان میں اتنی سکت ہی باقی نہ رہی تھی کہ ہونٹوں کو جنبش دے سکتے .... نوجوان نامہ نگار نے بڑے اضطراب سے ہاتھ ملتے ہوئے اپنی روانگی کا اعلان کیا اور پھر رومال سے ناک صاف کرنے لگا..... عائشہ کے ادھیڑ عمر کسان باپ نے اسے ایک طرف لے جا کر، دس روپے پیش کئے اور درخواست کی کہ وہ اپنے اخبار میں اس واقعے کے متعلق کوئی ایسی ویسی خبر نہ بھیجے۔ شرفاں بی بی نے بھی اسے، وقت آنے پر، مزید خدمت کا یقین دلایا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ ہم یہ معاملہ پولیس کی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں .... عائشہ کی سہیلیوں نے ایک بار پھر اسے شک و شبے کی نظروں سے دیکھا اور وہ لاش پر آخری نظریں ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر آ کر اس نے ایک سگرٹ سلگایا اور سر جھکائے میونسپل کمیٹی کی طرف چل دیا.... میونسپل کمیٹی کے خوب صورت، پھولوں بھرے لان میں پہنچ کر اس نے جیب سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا، قلم کھولا اور پتھریلے بنچ پر بیٹھ کر، خبر مرتب کرنے لگا... کاغذوں کا پلندہ دراصل میونسپل کمیٹی کا ایک پرانا

ایجنڈہ تھا جو ہر کاغذ کے ایک طرف سائیکلو سٹائل کیا گیا تھا، دوسری طرف خالی تھی اور اس کے قسم کار، جادو اسی خالی میدان میں دوڑ رہا تھا... خبر مرتب کرتے کرتے اس نے کاغذوں کو الٹا کر دیکھا... پرانے ایجنڈے کی شقیں اس کا منہ چڑانے لگیں،

۱۔ احاطوں کی تقسیم کے بارے میں معزز ممبر مولوی احمد میاں کی تجاویز

۲۔ سب کمیٹی تعمیرات کی سفارشات

۳۔ "دائرہ ادب" کو ادبی خدمات کے سلسلے میں میونسپل کمیٹی کی طرف سے امداد دی جائے۔ (درخواست عارف عزیزی صاحب۔ پیش کردہ معزز ممبر راؤ عبدالرب صاحب)

..........................

اس نے گھبرا کر کاغذ اپنی جیب میں ٹھونس لئے۔ نیا سگرٹ ہونٹوں میں دبایا اور سوچنے لگا کہ عائشہ ایک سادہ لڑکی تھی؛ جسے ٹھکرایا گیا وہ یہ ذلت برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ اب اگر میونسپل کمیٹی کے اس پرانے ایجنڈے کے کھردرے کاغذوں پر اس کی موت کی خبر لکھی گئی تو کیا اس کی روح یہ توہین برداشت کر سکے گی نہیں، ہر گز نہیں۔ اس نے بوکھلا کر اپنے آپ سے کہا اور اٹھ کر چل دیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گھر جا کر اطمینان سے صاف، ستھرے ملائم کاغذوں پر یہ خبر لکھے گا۔

وہ فوارے والے چوک کی طرف سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن کے سامنے چمن بازار میں آگیا اور عائشہ کی موت کو بھلا کر اور چیزوں کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اوپر مارچ کا دُھلا، دھلایا آسمان خاموش اور پُرسکون تھا۔ اس کے چاروں طرف مصروف لوگوں کی آوازیں تھیں۔ اڈے پر آتی جاتی، ریلو بیکل لاریوں کے انجن بھری برسات کے غصیلے بادلوں کی طرح گرج رہے تھے۔ پیچھے پھلوں والے کی دکان پر ٹرانسسٹر ریڈیو سے ایک دھیمے سروں میں گایا ہوا نسوانی لوک گیت فضا میں گندم کی کچی بالیوں کی ملائم خوشبو اور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کی گمبھیر اداسیاں بکھیر رہا تھا۔ معاً فضا میں ایک ہوائی جہاز نمودار ہوا۔ سارے بازار کی نظریں اوپر اُٹھ گئیں۔ اس علاقے میں ہوائی جہاز کی گونج اتنی ہی غیر متوقع تھی جتنی نیویارک کے شہر میں اونٹ کی بلبلاہٹ۔ لوگوں کی نظریں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں اور اُن کے منہ مارے حیرت کے کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا پان سگریٹ کی دکانوں اور چونگی کے سامنے سے ہو کر ریلوے اسٹیشن کی مسجد کے سامنے آگیا، جس کے چاروں طرف گندگی کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے اور ان میں سے ہلکا ہلکا تعفن اُٹھ رہا تھا۔ مسجد کی چھوٹی سی خوبصورت عمارت کا کچا صحن ارنڈ کے بے ہنگم اُبھرے سبز پودوں کی گھنیری باڑ سے گھرا ہوا تھا۔ نوجوان نامہ نگار کو یاد آیا کہ اُس نے

قرآن کی پہلی آیت اِسی صحن میں پڑھی تھی۔ اُس وقت اس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہ تھی اور اس مسجد کی امامت مولانا عبدالغفار ایسے فاضل اجل کے سپرد تھی۔ وہ جب بچوں کو قرآن کا درس دیتے تھے تو اُن کی بالو ایسی سپید داڑھی میں نور و حکمت کی کئی شمعیں جل اُٹھتی تھیں۔ اس کی آنکھیں اپنے اوّلیں مکتب کے در و دیوار کو دیکھ رہی تھیں اور اس کا ذہن ماضی کی گلپوش وادیوں میں گھوم رہا تھا۔ کتنے اچھے دن تھے وہ بھی فضا نکھری نکھری رہتی تھی۔ گندگی کے ڈھیر نہیں تھے۔ ارنڈ کی گھنیری باڑ کی جگہ سُرخ گلاب کے ترشے ہوئے پودوں کی قطار تھی اور ہارون آباد کی ہواؤں میں ٹبوں کے انجنوں کی گڑگڑاہٹ کی بجائے، گاؤں گاؤں سفر کرنے والے بنجاروں کے معصوم گیت اُبھرتے تھے، یا اذانوں کے الوہی نغمے چاروں طرف روشنی، اُمید، حُسن اور نجات کا پیغام دلوں میں اُتارتے تھے۔

وہ جُوتے اتار کر بڑی خاموشی سے مسجد کے صحن میں داخل ہو گیا۔ مسجد کسی ویران درگاہ کی ایسی خالی تھی۔ اندر محراب کے قریب، ایک نوجوان، مفلوک الحال طالب علم موطا کی ایک جلد کھولے، دُنیا و مافیہا سے بے خبر، مطالعے میں غرق تھا۔ وہ جلدی سے طالب علم کی طرف بڑھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کندھے سے کندھا ملا کر طالب علم کے ساتھ بیٹھ جائے اور اس سے بڑے احترام کے ساتھ، دھیمی آواز میں، امام مالک کی زندگی کے بارے میں گفتگو کرے، قرآن کے مقطعات

کا راز پوچھے اور باتوں باتوں میں ہارون آباد کے خوشبودار ماضی کی طرف لوٹ جائے۔ لیکن معاً اس نے اپنی جیب میں میونسپل کمیٹی کے پرانے ایجنڈے کا بوجھ محسوس کیا اور ان کاغذوں کی خالی جانب، ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھی ہوئی عائشہ کی موت کی غیر مکمل خبر اور عائشہ کے باپ کا رشوت میں دیا ہوا دس روپے کا نوٹ، اس کے ذہن میں مقید سانپ کی طرح کلبلانے لگا طالب علم نے موٹاسے نظریں اٹھا کر از حد معصومیت کے ساتھ اسے دیکھا۔ اس کے پتلے پتلے سرخ لبوں پر ایک اَن چھوئی، پاکیزہ مسکراہٹ کھیلنے لگی اس کی آنکھوں نے حیرت سے پوچھا۔ تم اس تنہا تنہا دنیا میں کہاں سے چلے آئے ہو۔ جبکہ باہر جھوٹ اور فریب کا بازار گرم ہے اور تمہارے دل پر قفل پڑ چکے ہیں اور تمہاری آنکھوں پر چربی کی موٹی تہہ جمی ہوئی ہے۔ کیا تم اس اکیلے، ویران گوشے میں بھی ہمیں سکون اور خاموشی کے ساتھ تحصیل علم میں مصروف نہ رہنے دو گے؟۔ وہ ان پوچھتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا سکا اور گھبرا کر باہر نکل آیا۔ پان، سیگرٹ کی دوکانوں پر کراچی کی کمرشل سروس نشر ہو رہی تھی۔ اب آپ ہمارا نئی فلموں کے گیتوں کا پروگرام سُنیئے،

خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو

وہ جلدی جلدی میونسپل پبلک لائبریری کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر خبر بھیجنے میں دیر ہو گئی تو روزنامہ "رہبر" کا تاجر ایڈیٹر خود ہارون آباد آ کر

اور اپنے پھولے پھولے گالوں پر غصّے کی سُرخی پھیلا کر، اس سے جواب طلبی کرے گا اور اس کی جگہ کسی اور کو نامہ نگار مقرر کرنے کی دھمکی دے گا اور اس وقت تک نہیں ملنے گا جب تک کہ وہ کسی نہ کسی طرح دو چار زمینداروں کو بلیک میل کر کے اسے ایک موٹی سی رقم نہیں تھما دے گا۔ اس نے گھر جا کر خبر مرتب کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور میونسپل پبلک لائبریری کے عزمتی زینوں پر بیٹھ کر خبر مرتب کرنے لگا۔

وہ لائبریری کے زینوں پر بیٹھا خبر لکھ رہا تھا۔ اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا...... اور اس کے اندر کی آنکھیں ہر وہ منظر دیکھ رہی تھیں جس کا حادثہ سے کوئی بھی تعلق رہا ہو گا۔

وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ہارون آباد کے شمال جنوب میں ان گنت وسیع کھیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا گیا ہے۔ ان کھیتوں میں کپاس اور گندم اُگتی ہے۔ گنّے کے اُونچے لمبے پودے ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ لچک لچک جاتے ہیں۔ کھیتوں کے اس سلسلے کو کئی نہریں قطع کرتی ہیں۔ فور آر۔ فائیو آر۔ سکس آر۔ سیون آر۔ نائن آر۔ سکس آر نہر کے کنارے، ان کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔ اس گاؤں کو کوئی باقاعدہ سڑک نہیں جاتی۔ صرف بل کھاتی نازک نازک پگڈنڈیاں ہیں جو صاف ستھرے جھونپڑوں پر مشتمل اس چھوٹی سی آبادی کا رشتہ باہر کی دنیا سے قائم کرتی ہیں۔

وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ اس گاؤں میں ایک مثیار لڑکی رہتی ہے۔ اس کے سیاہ بال گھٹاؤں کو شرماتے ہیں۔ اس کے رخساروں پر حیا کی لالیاں ہیں اس کے ہونٹوں پر سورج کے طلوع و غروب کی کئی لالہ گوں داستانیں رقم ہیں۔ اس کی کلائیوں میں چوڑیاں کھنکتی ہیں تو کئی نغمے تخلیق ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں کبھی نہ بجھنے والی پیاس ہے۔ یہ وہی پیاس ہے۔ جو دنیا کے سب سے بڑے انسان نے عرب کی نسوانی آنکھوں میں دیکھی تھی تو فرمایا تھا۔ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"۔ یہ وہی پیاس ہے جو رابعہ بصری کی آنکھوں میں نمایاں ہوئی تو عرب و عجم کے سارے بڑے بڑے عالم اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ وہی پیاس ہے جو زبیدہ کی نگاہوں میں چمکی تو اس کے بالوں کی ہر لٹ کسی نہ کسی سطوت نشان خلیفہ پر جا پڑی۔ یہ وہی پیاس ہے جو جون آف آرک کی نظروں میں خمار بن کر چھلکی تھی۔

وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کہ وہ مثیار لڑکی اپنی بھوری بھینس کا دودھ دوہنے اور بیلوں کے سامنے تازہ چارہ پھیلانے کے بعد، سرسوں کے تیل سے جلتے ہوئے دیے کی مدھم، زرد روشنی میں اردو کی پانچویں کتاب سے سبق یاد کرتی ہے اور اپنے گاؤں کے سکول سے پرائمری کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہارون آباد کے گرلز ہائی سکول میں داخلہ لینے کے خواب دیکھتی ہے۔ فقیر والی کے نواحی گاؤں کی یہ عجیب غریب، پُراسرار اپسرا چلتے پھرتے ایک خود ساختہ گیت

گنگناتی رہتی ہے،

نی میں کھمب لا کے اُڈ جاواں

ہرونا باد دے سکولاں نوں

(اری میں پر لگا کر اڑ جاؤں ..... ہارون آباد کے سکولوں کی طرف)

وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کہ چیت کے مہینے میں بہار کی مہکاروں سے گرانبار ہوا شرابی کی طرح لڑکھڑا کر چلتی ہے۔ کھیتوں کی منڈیروں پر اُجلے پھول کھلتے ہیں اور عائشہ کے مہکتے ہونٹوں کی سرخ کلیوں پر زندگی کے پہلے اور آخری ارمان کا جوبن ایک البیلی مسکراہٹ کے روپ میں چھا گیا ہے۔ اپنے گاؤں کے سکول کی پانچویں جماعت میں اس نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے ہیں اور ڈسٹرکٹ انسپکٹرس نے اُسے ایک سنہری حاشیے والا سرٹیفکیٹ بہاولنگر سے بھیجا ہے۔

وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کہ عائشہ کے کسان باپ نے ململ کی سفید پگڑی باندھی ہے۔ ریشمی دھوتی کے لڑ زمین تک چھوڑے ہیں۔ مونچھوں کے بال بال کو سرسوں کے تیل سے چمکایا ہے اور پرسوں سے بعد آنکھوں میں کاجل کی سلائی پھیری ہے۔ وہ آج اپنی بیٹی کو لے کر ہارون آباد جا رہا ہے۔ وہاں اس کا بھائی میونسپل کمیٹی میں چپڑاسی ہے اور اس کی بیٹی اسی سکول میں پڑھتی ہے جہاں عائشہ داخل ہونا چاہتی ہے۔ بھائی اور بھتیجی کی وجہ سے اُسے

عائشہ کو داخل کرداتے ہیں کوئی دقّت نہ ہوگی۔ وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ عائشہ سکول کی لڑکیوں کے ہجوم میں بولائی بولائی گھرتی ہے۔ چھٹی جماعت کی الفتی لڑکیاں اُسے چھیڑ رہی ہیں۔ کوئی اس کی پسلی میں ٹھوکا دیتی ہے۔ کوئی جلدی سے اس کے ہونٹ چوم کر بھاگ جاتی ہے۔ ایک اُس کی نوخیز لیکن صحتمند چھاتیوں کو بڑے اطمینان سے ٹٹول کر کہتی ہے "ہائے نی عائشاں تو تو پوری عورت ہے"۔ دوسری اس کے کولھوں پر زور دار دھپ جما کر اور بڑے پیار سے اس کی گردن میں باہیں ڈال کر، از حد رومانٹک موڈ میں، ترنم کے ساتھ گویا ہوتی ہے۔ "کھناں دیے پلیے۔ کچم کچّی چھلیے ... ... پنڈ دیے چھوہریے۔ گنّے دیے پودیے تینوں چوپ جاواں"۔

وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کہ عائشہ اپنی جماعت میں بیٹھی، بڑے انہماک کے ساتھ اُستانی کے منہ سے نکلا ہوا ایک، ایک لفظ سُن رہی ہے اس کی آنکھیں کتاب پر جھکی ہیں۔ اس کے سامنے، ڈیسک پر ایک موٹی سی رف کاپی کھلی ہے اور اس کی گداز مگر مضبوط انگلیوں نے ایک نیلے رنگ کا خوبصورت قلم تھام رکھا ہے۔ اور اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کے ارادے ناچ رہے ہیں۔

وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کہ چھٹی کے بعد جب ہوسٹل کی لڑکیاں رستہ پھاندنے کا پروگرام بناتی ہیں تو عائشہ اپنے لبوں پر دائمی مسکراہٹ لیے، چپکے سے اُٹھتی ہے اور ہوسٹل کی لائبریری میں آ بیٹھتی ہے۔ اس نے تعلیم

مکمل کرنے کے بعد ایک مثالی معلمہ بننے کا مصمم فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لئے وہ عموماً تعلیم کے موضوع پر کتابیں پڑھتی ہے۔ یہ کتابیں اس کی زندگی ہیں۔ وہ اپنی نیندوں، اپنے خوابوں اور اپنی تفریحوں سے کئی لمحے چرا کر، ان کتابوں کی دنیا میں بسر کرتی ہے۔ اس دنیا میں اس کے لئے تسکین ہے، مستقبل کے حسین خواب ہیں، آئندہ زندگی کی مٹھاس ہے۔

وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول ہارون آباد کی چار دیواری کے اندر رنگ و نور کا ایک ہنگامہ بپا ہے۔ آج سالانہ تقسیم انعامات کا دن ہے بہاولپور سے ڈویژنل انسپکٹرس تقریب کی صدارت کرنے آئی ہے۔ میٹرک کے امتحان میں چند ہفتے باقی ہیں۔ عائشہ کو سب سے زیادہ انعامات ملتے ہیں وہ اب تک اپنی ہر جماعت میں اوّل آتی رہی ہے اور سکول کی بہترین مقررہ ہے۔ وہ سکول کی بہترین اتھلیٹ ہے لیکن آج خلاف معمول اس کا چہرہ بجھا بجھا ہے۔ مسلسل محنت اور انتھک کام نے اس کی صحت برباد کر کے رکھدی ہے۔ سول ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر نے اسے ہدایت کی ہے کہ آئندہ وہ مطالعہ کم کر دے، زیادہ محنت سے احتراز کرے اور کسی اتھلیٹ گیم میں حصّہ نہ لے۔ ورنہ اُس کے دل کی روز افزوں کمزوری اور اعصاب کی بڑھتی ہوئی شکستگی کسی بھی لمحے اس کی موت کو آواز دے سکتی ہے۔

وہ لکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ دل کی کمزوری بڑھتی گئی۔ اعصاب کی شکستگی

میں اضافہ ہوتا رہا لیکن وہ آگے بڑھتی رہی۔ مستقبل کے حسین خواب اُسے اپنی طرف کھینچتے رہے اور اپنی تمناؤں کی شبنم پلا پلا کر پالے ہوئے مقصد کو حاصل کرنے کا ولولہ، اسے کتابوں کی دُنیا سے باہر آنے سے روکتا رہا۔ اور تب ایک دن یوں ہوا کہ انگریزی کے پیریڈ میں لانگ فیلو کی نظم پڑھتے پڑھتے اس پہ دل کا شدید دورہ پڑا۔ وہ تیورا کر اپنی سیٹ سے نیچے گر پڑی۔ اس کی آنکھوں کی پُتلیاں الٹ گئیں اور اس کا بدن پسینے میں نہا گیا۔ سول ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر ایک بار پھر سکول میں آئی اور اپنے لمبے سے سفید چوغے کی گہری جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگی۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں کہ اس کو ریسٹ کرنا چاہیئے ورنہ یہ مر جائے گی۔"

جب عائشہ کی طبیعت ذرا بحال ہوئی تو اس نے مضمحل آواز میں کہا۔

"ریسٹ تو اب میٹرک کے امتحان کے بعد ہی ہو گا۔"

میٹرک کا امتحان ہوا۔ نتیجہ نکلا۔ وہ سارے سکول میں اول آئی۔ روزنامہ "رہبر" میں خبر شائع ہوئی اور کچھ دنوں کے لئے آرام کرنے وہ اپنے گاؤں چلی گئی۔ بھوری بھینس کے طاقتور دودھ نے اسے کچھ سہارا دیا اور کھُلی ہواہیں اس کے اعصاب قدرے سکون پذیر ہو گئے۔

آج سے تین دن پہلے وہ میٹرک کا سرٹیفکیٹ لینے اپنے سکول آئی تو

اس کی چچازاد بہن نے اسے زبردستی ایک دن کے لئے اپنے پاس ہوسٹل میں ٹھہرا لیا۔ ایک شام پُرانی سہیلیوں کے مجبور کرنے پر وہ اُن کے ساتھ مل کر رسّہ پھاندنے لگی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کئی ماہ سے دل کی کمزوری اور اعصاب کے اضمحلال کی مریض چلی آرہی ہے۔ اپنی درخشاں کامیابی کی خوشی میں وُہ یہ سب کچھ بھول گئی اور اچھل پھاند میں مصروف رہی۔ مگر اس دفعہ اس کا دل ڈوبا اور نہ اعصاب پر تھکن سوار ہوئی۔ وہ خوش تھی۔ کہ اس کی صحت لوٹ آئی ہے۔ اسی نشے میں اُس سے گھی کا وہ ٹین بھی شرفاں بی بی کو بخش دیا جو اُس کے باپ نے، منع کرنے کے باوجود، اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ اسے اپنی ہونہار بیٹی کی صحت کا بہت خیال تھا۔ ایک دو دن کے لئے بھی وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بیٹی خالص گھی کے علاوہ کوئی اور گھی کھائے۔

میٹرک کا سرٹیفکیٹ لینے کے بعد عائشہ کالج میں داخلہ لینے بہاولپور چلی گئی۔ داخلے کا فارم پُر کیا۔ کالج میں سیٹیں کم تھیں اور لڑکیاں زیادہ۔ پرنسپل ایک اکھڑ سی ادھیڑ عمر عورت تھی، جس کے چہرے کے حقیقی خدّوخال پوڈر اور سُرخی کی دبیز تہوں کے نیچے چھُپے ہوئے تھے۔ داخلے کے دن ہی اس کی کمائی کے دن تھے۔ جس لڑکی کے پاس روپیہ یا سفارش تھی، اس کے داخلے کے فارم پر منظوری کے دستخط ہو جاتے تھے۔ عائشہ ایک سادہ سی دیہاتی لڑکی۔ اُس کے پاس محنت تھی، شوق تھا، مستقبل کے خوبصورت خواب تھے،

مگر روپیہ یا سفارش نہ تھی۔ چنانچہ کسی نے اس کے نمبروں کی طرف نہ دیکھا۔ بد مزاج پرنسپل نے اس کا فارم بڑی حقارت سے ایک طرف ڈال دیا۔ "آجاتی ہیں جہاں سے داخلہ لینے، جیسے باپ نے کالج میں جگہ ریزرو کروا رکھی ہو۔ سیٹیں ختم ہو چکی ہیں۔"

ساری محنت غارت ہو گئی۔ شوق ہوا بن کر اُڑ گیا۔ مستقبل کے تمام محبوب خوابوں کے تاج محل لامتناہی مایوسیوں کے آگرہ میں پیوند خاک ہو گئے اور عائشہ کی بے بس آنکھوں میں آنسوؤں کی گھٹا اُمڈ آئی۔ مگر آنسوؤں کی گھٹائیں شور زمین پر برستی ہیں، ان سے کوئی فصل نہیں اُگتی۔

عائشہ واپس ہارون آباد آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی اور ہونٹ خاموش تھے۔

"کچھ تو کہو عائشاں بی بی، داخلہ مل گیا؟" شرفاں بی بی نے پوچھا۔

لیکن جب خوابوں کے وہ نگر اجڑ جائیں جن کو بڑے پیار، بڑی آرزو سے بسایا ہو تو لبوں پر قفل پڑ جاتا ہے۔ اور خاموش نگاہوں کے کشکول میں میں سوائے سقف و بام کے علاوہ کچھ نہیں رہتا۔ سب کچھ چھن جاتا ہے۔

شرفاں بی بی سر توڑ کوشش کے باوجود عائشہ کے لبوں کا کواڑ نہ کھول سکی۔

اسی دن جب دوپہر ڈھلنے لگی تو عائشہ کو دل کا بھیانک دورہ پڑا۔ اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ہونٹوں کی سُرخ کلیاں ہمیشہ کے لئے مرجھا گئیں۔

سُنتے پنگھٹ ایسی دوپہر ہولے ہولے ڈھلتی رہی۔ موت کے کالج میں داخلہ لینے سے کوئی رشوت خور، اکھڑ پرنسپل اُسے نہ روک سکی۔

نوجوان نامہ نگار نے خبر لکھتے لکھتے سر اوپر اٹھایا تو چاروں طرف شام کے دھندلکے پھیل گئے تھے۔ اس نے سگریٹ کا آخری کش لگایا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ لائبریری بند ہو چکی تھی اور سامنے سڑک پر میونسپل کمیٹی کا گندگی اٹھانے والا سبز ٹرک گڑگڑاتا ہوا گذر رہا تھا۔ دائیں طرف ہارون کلب کی چھوٹی سی عمارت میں روشنی ہو رہی تھی اور لائبریری کے لان میں، دھندلکوں میں لپٹے ہوئے، پھول ایک دوسرے سے الگ تھلگ، چپ چاپ، تنہا تنہا دکھلائی پڑ رہے تھے۔

نامہ نگار نے سوچا کہ اگر یہ خبر ڈاک سے بھیجی گئی تو شائع ہوتے ہوتے تین دن پرانی ہو جائے گی اور اس عرصے میں ممکن ہے بہاولپور سے ایک اور روزنامے کا نامہ نگار یہ خبر لے اُڑے۔ وہ سخت پریشان ہوا۔ معاً اس کے ذہن میں ایک شعلہ سا چمکا اور وہ مسکراتا ہوا ٹیلیفون ایکسچینج کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹیلیفون ایکسچینج، مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت اور گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی عمارتوں کے درمیان واقع تھا۔ اس نے ایکسچینج کی چار دیواری میں داخل ہونے سے پہلے ایک نظر گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول پر ڈالی۔ وہاں موت کا سنگین سناٹا سایہ فگن تھا۔ عائشہ کا جنازہ شاید فقیر والی لے جایا جا چکا تھا۔

ٹیلیفون آپریٹر نے روزنامہ "رہبر" بہاولپور کے ٹیلیفون سے رابطہ قائم کر کے ماؤتھ پیس نامہ نگار کے حوالے کر دیا اور اس نے دوسری طرف اسسٹنٹ ایڈیٹر اقبال احمد صدیقی کو خبر لکھانی شروع کر دی۔

"تم نے یہ تمام واقعات کیسے حاصل کیے" اقبال احمد صدیقی نے پوچھا۔

"جھوٹ بول کر" نامہ نگار نے جواب دیا۔

"بکواس مت کرو..... میں بہت مصروف ہوں، سیدھی طرح بتاؤ ان واقعات کا تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"یار تمہیں کس اُلو کے پٹھے نے اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا ہے۔ سیدھی بات ہے، جب میں نے اس کی موت کی خبر سُنی تو میں سیدھا ہوسٹل چلا گیا۔ وہاں میں نے اس کی چچازاد بہن سے باتیں کیں، اس کے باپ اور چند سہیلیوں سے ملا، کچھ سرگوشیاں سنیں، عائشہ کو موت کی آغوش میں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بس خبر مرتب ہو گئی۔"

"اچھا خیر۔ اور کچھ لکھانا ہے؟"

"ہاں۔ عائشہ کی موت گورنمنٹ ہائی اسکول فار گرلز کے ہوسٹل میں واقع ہوئی جہاں اس نے پانچ سال مستقبل کے پیارے خوابوں کے سنگ گزارے تھے اور اس موت پر اس کی چچازاد بہن کا پہلا تاثر یہ تھا کہ عائشہ نے خودکشی کی ہے۔"

"تمہارے پاس عائشہ کی کوئی تصویر بھی ہے؟"

"نہیں۔ لیکن اگر تصویر ہوتی بھی تو رہبر کے لئے ہرگز نہ بھیجتا۔"

"کیوں؟"

"اس کیوں کا جواب لینے سے پہلے تم رہبر کی لکھائی چھپائی بہتر بناؤ۔"

"اچھا اب جو کچھ تم نے لکھوایا ہے، وہ میں دہراتا ہوں۔ کوئی بات رہ نہ جائے۔"

فارغ ہو کر وہ ایکسچینج کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ ہارون آباد مرکری لائٹس سے جگمگا رہا تھا اور آسمان پر اکا دکا ستارے نمودار ہو گئے تھے۔ مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت کے لان میں ٹاہلی کے درخت ٹہنیاں جھکائے کھڑے تھے۔ وہ سگرٹ سلگا کر، لائیکا کاٹن فیکٹری کے سامنے سے ہوتا ہوا، اس سڑک پر آ گیا جو سیاہ ناگن کی مانند لہراتی ہوئی فورٹ آباد نہر کے پل تک چلی گئی تھی۔ سول ہسپتال کی خوبصورت، وسیع و عریض عمارت آئی اور گذر گئی، راجہ بردرز کاٹن فیکٹری پیچھے رہ گئی، محلہ نوہر پورہ کے کچے مکان جانو گھومتے ہوئے اندھیرے میں ڈوب گئے، اور وہ چلتا رہا اور یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا گیا کہ اس دیہاتی لڑکی عائشہ کی زندگی کے معنی کیا تھے؟ کل بارہ بجے کی ٹرین سے رہبر کے پرچے آئیں گے اور صفحہ اوّل پر ایک بڑے سے چوکھٹے میں وہ لڑکی چھپے ہوئے الفاظ کے روپ میں جلوہ گر ہوگی۔ ہارون آباد اور بہاول پور میں ایک ہنگامہ بپا ہو جائے گا۔ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹرس اس بات

کی تردید کرے گی کہ عائشہ کی موت سکول کے ہوسٹل میں واقع ہوئی تھی۔ اس طرح سکول کی بدنامی ہوتی ہے نا۔ بہاولپور کے گرلز کالج کی رشوت خور، اکھڑ پرنسپل "رہبر" کے ایڈیٹر کو فون کرے گی اور ڈویژن کے بڑے بڑے افسروں سے اپنے قریبی تعلقات کے زعم میں دھمکی دے گی کہ اس خبر کی تردید کرو ورنہ میں سخت اقدام کروں گی اور "رہبر" کا ایڈیٹر تردید شائع کرنے کا وعدہ کرے گا اور اپنے ہارون آباد کے نامہ نگار کو جھوٹا اور ایکسپلائٹر قرار دے گا، لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر ایک مخصوص عرصے تک تردید شائع نہیں کرے گا۔ عائشہ فقیر والی کے ایک نواحی گاؤں کی انوکھی مٹیار، جو اپنی زندگی میں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول ہارون آباد کی ایک گمنام طالبہ تھی۔ حکومت کا ایک چھوٹا سا ذریعہ آمدنی تھی۔ ایک، حاضری کے رجسٹر پر لکھے ہوئے کئی ناموں میں سے ایک بے نام سا نام تھی۔ کلاس روم کے ایک ڈیسک پر بیٹھنے والی مخلتی شخصیت تھی، جسے سکول کی چار دیواری اور ایک سنتے سے گاؤں سے باہر کوئی نہ جانتا تھا، اب، اپنی موت کے بعد ایک ہنگامہ بن جائے گی۔ ہنگامہ جو دو تعلیمی اداروں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ہنگامہ جو شاید دور دور تک پہنچے گا۔

ہاں یہ ہنگامہ، دور دور تک پہنچے گا۔ لیکن اگر عائشہ زندہ رہتی، اپنی محنت اور شوق سے علم کی پیاس بجھائے چلی جاتی، تو بھی تو ایک ہنگامہ بپا ہو جاتی، اور شاید یہ ہنگامہ بھی دور دور تک پہنچتا۔ *

# سُرخ جھنڈی

صادِق وڈّو ایک محنتی اور شریف النفس مزدور تھا۔ وہ سڑکیں کُوٹنے کا کام کرتا تھا۔ یہ کام نہ ملتا تو کوئی اَور مزدوری کر لیتا اور دن میں تین چار روپے کما لیتا۔

وہ جو کام بھی کرتا، دل لگا کر کرتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وُہ فطرتاً نیک نیّت، سیدھا سادا اُور رزق میں حرام، حلال کی تمیز رکھنے والا انسان تھا اُور دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ مدّت سے اس کی گھریلو زندگی، سخت ناخوشگوار اور تکلیف دہ چلی آ رہی تھی اور اس کو بدلنے کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا دراصل اس کی از حد مسکین طبیعت اور چپ چاپ ظلم سہنے والے مزاج نے اس سے ہر وہ قوت چھین لی تھی جس کا جراُت اور مزاحمت سے ذرا سا بھی واسطہ تھا۔ وہ ہر جائز و ناجائز دباؤ میں آجاتا تھا۔ حقیقی خدا کے آگے تو خیر ہر ذی شعور انسان جُھکتا ہے، لیکن وہ، رعب میں آکر، مصنوعی خداؤں کے سامنے بھی سجدہ ریز ہو جاتا تھا

یہ اس کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ ایک دیہاتی گھنے سے تعلق رکھتا تھا مبہادنگر کے شہر میں یوں بولایا، بولایا رہتا تھا جیسے کوئی جنگلی ہرن انسانوں کے ہجوم میں آنکلا ہو اور حیران، حیران نظروں سے اس انوکھی دُنیا کو دیکھ رہا ہو۔

یار لوگ، اس کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اور موقع شناسوں کو اس کا شکار کرنے میں بڑی آسانی رہتی تھی۔ اس کی گھریلو زندگی کی ناخوشگواری اور تلخی کا آغاز بھی اس کی اسی کمزوری کی وجہ سے ہوا۔

اس کی موجودہ ساس کی اور اندیشی نگاہوں نے اُسے انھی دنوں اپنا داماد منتخب کر لیا تھا جب اس کی شادی کا سوال بھی نہ اٹھا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں، کاٹھ حکیم امیر دین، میں رہتا تھا۔ یہ گاؤں ہارون آباد کے نواحی علاقے میں واقع تھا۔ وہ سارا دن، اپنے باپ کے ساتھ، کولھو کے بیل کی طرح کام میں جُتا رہتا۔ ماں سوتیلی تھی، کچھ روکھا سوکھا ملتا تو کھا لیتا ورنہ، کوئی شکایت کئے بغیر، لمبی تان کر سو جاتا۔ اس کی ساس کو کسی ایسے داماد کی تلاش تھی جو، بیٹی کے ساتھ، اس کی زندگی کا بوجھ بھی اٹھا سکے۔ چونکہ اس کا بیٹا بہت سخت گیر تھا اور اپنی بیوی کے علاوہ اپنی ماں سے بھی اَن تھک کام لیتا تھا اور اگر وہ گریز کرتی تو اس کی پٹائی بھی کر دیتا تھا۔ وہ اس مستقل عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ صادق وٹو نظروں میں تو پہلے سے تھا چنانچہ اس کے رشتے کی بات چلی تو اس نے صادق کے گرد کچھ اس طرح شیشے میں اتارا کہ اس کی بیٹی صادق کی بیوی بن گئی اور شادی

کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب صادق نے باپ سے علیحدہ ہو کر محنت مزدوری شروع کی تو ساس بھی اس کے گھر آ براجی۔ پہلے تو وہ بارندی آباد میں، آڑھت کی دکانوں پر بوجھ ڈھونے کا کام کرتا رہا اور پھر بہاولنگر آ گیا۔ ضلع کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے یہاں مزدوری کی شرح نسبتاً زیادہ تھی۔ اب اس کے گھر کا سارا کنٹرول اس کی ساس کے ہاتھ میں تھا اور وہ، ملکہ کی طرح، اپنے داماد، بیٹی اور تین ماہ کی نواسی پر یکساں حکومت کرتی تھی۔ تینوں میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس کے سامنے چوں بھی کر جائیں۔ وہ سیاہ و سفید کی مالک تھی اور جو دل چاہتا، کرتی تھی۔ اس کے رعب و دبدبے کا دائرہ اتنا پھیل گیا تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر، صادق دتو اپنی بیوی سے بھی بات نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ عموماً سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا۔ بدمعاشی کرنے کا حوصلہ تھا نہ یارا۔ بس گدھوں کی طرح کام کرتا رہتا اور اپنی قسمت کو کوس کوس کر موت کی دعائیں مانگا کرتا۔ اس کے علاوہ اور چارہ کار بھی کیا تھا۔

اپنے دوسرے ساتھی مزدوروں کے برعکس، اس کے جسم کی ساخت بہت، مختصر اور پتلی دُبلی تھی۔ لیکن کام کرنے میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اس وقت بھی کام کرتا رہتا جب اس کے ساتھی، سستانے کے لئے ایک طرف بیٹھ کر گپ شپ اڑاتے اور حقے کے کش لگا کر اپنی تکان دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سڑک پر کولتار پھانسنے والے بوائلر میں آگ سنسناتی رہتی اور

صادق وٹو کے پتلے پتلے بازو، ایک بڑے سے وزنی مگدر سے روڑی کوٹتے رہتے۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی شبنم دمکتی، اس کا سانس سینے میں تڑپتا رہتا، اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں شل ہو جاتیں لیکن مگدر کی حرکت رُکنے میں نہ آتی۔ مگدر اپنے پورے وزن کے ساتھ دھم دھم بجری پر گرتا رہتا اور سڑک کی سطح ہموار ہوتی رہتی۔

سڑکوں کی تعمیر بند ہوئی تو ساتھ ہی موسم سرما آگیا اور صادق وٹو کو بہاول نگر سے چھ میل دور، مشرق میں، بھوکاں والے پتن پر، کشتیوں کے پل کی نگرانی کا کام مل گیا۔ سردیوں میں جب ستلج کی سطح نیچی ہو جاتی اور پانی کا زور ٹوٹ جاتا، تو بھوکاں والے پتن کے قریب، کہ وہاں دریا کا پاٹ کم چوڑا تھا، کشتیوں کا پُل بنا دیا جاتا۔ اس طرح بہاول نگر کا رابطہ براہ راست عارف والا سے قائم ہو جاتا اور فاصلہ کم ہو جانے کی وجہ سے ضلع بہاول نگر کے مسافروں کو بڑی آسانی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ تمام ٹرانسپورٹ کمپنیاں اپنی بسیں اسی راستے پر چلانا شروع کر دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ لاتعداد مال بردار ٹرک، اَن گنت کاریں اور جیپیں اسی پل پر سے گزرتی تھیں۔

صادق وٹو کو پل کے سنتری کا کام تفویض ہوا تھا۔ وہ پل کے ایک سرے پر ہاتھوں میں سرخ اور سبز جھنڈیاں لیے کھڑا رہتا۔ جب دوسرے سرے والا سنتری سرخ جھنڈی کا اشارہ کرتا، تو صادق سبز جھنڈی ہلا کر اپنی طرف رُکے

ٹریفک کو پُل عبور کرنے کی اجازت دے دیتا اور جب صادق سُرخ جھنڈی ہلاتا تو دوسرے سرے پر سبز جھنڈی ہلتی اور اس طرف کے ٹریفک کا ریلا آہستہ آہستہ پل پر سے گذرنے لگتا۔

یہ کام یوں دیکھنے میں تو بہت آسان معلوم ہوتا تھا۔ نہ پینگ لگی نہ پھٹکری، بس کھڑے سُرخ اور سبز جھنڈیاں ہلاتے رہے۔ لیکن، درحقیقت، یہ بہت احتیاط طلب اور نازک کام تھا۔ ایک ذراسی غفلت، ایک ہلکی سی چُوک، کئی انسانی جانوں کا موت سے سودا کرسکتی تھی۔ ایک بار ایسا ہؤا بھی تھا۔ دوسرے سرے والا سنتری نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا کہ وہ صادق کی سبز جھنڈی کا اشارہ نہ دیکھ سکا اور اس نے بھی سبز جھنڈی ہلادی۔ دونوں طرف کا ٹریفک پل پر چڑھ دوڑا۔ پُل اتنا وزن برداشت نہ کرسکا اور درمیان سے ٹوٹ گیا۔ کئی بسیں، کئی کاریں اور کئی ٹرک دریا میں جاپڑے۔ ایک قیامت برپا ہوگئی خدا نے اتنا رحم کیا کہ زخمی تو بہت ہوئے لیکن ایک بچے کے علاوہ، جو دریا میں ڈوبا تو پھر اُبھر نہ سکا، کوئی انسانی جان موت کے منہ میں نہ گئی۔ دریا کے کنارے رہنے والے مضبوط ملاحوں نے سب کو بچالیا۔ اب بھی جب صادق کو وہ منظر یاد آجاتا تو وہ لرز اٹھتا۔ زخمیوں کی کراہیں۔ بچوں کی چیخیں۔ عورتوں کا اپنے شوہروں، بیٹوں اور بھائیوں کو بین کرکر کے پکارنا۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری دُنیا کسی بھیانک عذاب کی لپیٹ میں آگئی ہے۔ اسے تو اس وقت ہوش آیا

جب یہ بھیانک عذاب، عارف والا اور بہاول نگر کے ہسپتالوں میں منتقل ہو گیا۔ اور پھر یوں ہوا کہ منٹگمری اور وہاڑی سے کرینیں آئیں اور بسوں کاروں اور ٹرکوں کو دریا سے نکال کر پُل کی مرمت شروع ہوئی۔ مکمل ایک ہفتے کے بعد ٹریفک بحال ہو سکا۔

اس دوران میں صادق وٹو کی ملازمت کو بھی زبردست خطرے کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن تحقیقات کے بعد جب پل کے ٹھیکیدار کو معلوم ہو گیا کہ غلطی دوسرے سنتری کی تھی تو اس نے سُرخ اور سبز جھنڈیاں دوبارہ صادق وٹو کو تھما دیں۔ ویسے دل ہی دل میں ٹھیکیدار نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ روڈز اینڈ بلڈنگ کے محکمے سے جلد از جلد منظوری لے کر پُل کے دونوں سروں پر آٹومیٹک سگنل نصب کر دے گا۔ ورنہ آئندہ اس قسم کا حادثہ ہوا تو پھر پُل کا ٹھیکہ نہیں ملے گا۔ لیکن اس فیصلے سے اس نے اپنے کارندوں کو آگاہ نہ کیا۔ مبادا سنتری بددل ہو کر بھاگ جائیں۔ حکومت کے بے پناہ ترقیاتی کاموں کے سبب، کسی بھی کام کے لئے نئے مزدوروں کا ملنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور تھا۔

دوسرے سرے کا سنتری بدل دیا گیا۔ کام پھر شروع ہو گیا۔ ٹریفک اسی طرح پُل عبور کرنے لگا۔ دونوں سنتریوں میں مکمل تعاون تھا۔ تمام معاملات اپنے پُرانے معمول پر آ گئے تھے۔ دوبارہ کوئی حادثہ ہونے کے امکانات فی الحال

ختم ہو گئے تھے۔ لیکن ایک دن صادق ڈٹو کو عجیب و غریب الجھن کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسرے سرے والے سنتری نے سُرخ جھنڈی سے ٹریفک روک رکھا ہوا تھا اور صادق ڈٹو سبز جھنڈی ہلا ہلا کر اپنی طرف کا ٹریفک گزار رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ادھر کے سنتری نے سبز جھنڈی ہلا دی اور صادق ڈٹو نے حسبِ معمول ادھر کا ٹریفک روکنے کے لئے جب سُرخ جھنڈی لہرائی تو عین اُسی لمحے ایک لمبی سی سیاہ کار، ایک چھوٹا سا سبز پرچم لہراتی ہوئی، ایک جھٹکے کے ساتھ، اس کے قریب آ کر رُکی اور باوردی ڈرائیور نے، کھڑکی میں سے اپنا چہرہ نکال کر، لال پیلا ہوتے ہوئے کہا۔

"تم یہ کار نہیں روک سکتے۔ یہ وزیر صاحب کی کار ہے۔"

صادق ڈٹو پہلے تو بہت سٹپٹایا اور گھگھیا کر ڈرائیور سے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ پل پر سے دوسری طرف کا ٹریفک گذر رہا تھا۔ معاً اس کے ذہن میں وہ دردناک حادثہ گھوم گیا اور اس نے ڈرائیور کو کوئی جواب دیئے بغیر اپنی نظریں یوں پھیر لیں جیسے اس نے اس کی کوئی بات سُنی ہی نہ ہو۔ اس کے ہاتھ میں سُرخ جھنڈی بدستور لہراتی رہی۔ تب کار کا پچھلا دروازہ کھُلا اور اندر سے ایک ایسا تمتماتا چہرہ نمودار ہوا جو اخباروں میں کارٹون بنانے والوں کا محبوب موضوع تھا۔

"سنتری کو اپنا کام کرنے دو۔" لمبی، نوکدار ناک اور چندھی آنکھوں والے،

تھل متھنے چہرے نے اپنے ڈرائیور سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "یہ سنتری قانون کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اور قانون کا حکومت کو بھی احترام کرنا چاہیئے۔"

"کوائیٹ رائٹ سر، قانون کی نظروں میں وزیر اور مزدور سب برابر ہیں۔" وزیر کے پریس سیکرٹری نے ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور وزیر کے باہر نکلتے ہی وہ بھی ایک قلانچ بھر کر کار سے باہر آ گیا تھا۔ وزیر کی تائید کرنے کے بعد اس نے ایک چھوٹی سی نوٹ بک میں نوٹس لینے شروع کر دیئے تاکہ یہ واقعہ اشاعت کے لئے اخباروں میں بھیجا جا سکے۔

صادق وٹو منہ کھولے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا لیکن اس کے مقابلے میں ڈرائیور کو جو ڈانٹ پڑی تھی، اس سے اس کو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا تھا اور یہ نیا احساس اس کے جسم میں بجلی کی رو بن کر دوڑ گیا تھا۔ اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی اور جھکا ہوا سر قدرے اونچا ہو گیا تھا۔ جب دوسری طرف کا ٹریفک بند ہو گیا تو اس نے ایک نئی ادا سے سبز جھنڈی لہرائی۔ زیرِ لب صلواتیں سُناتے ہوئے ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار اس کے سامنے سے یوں گذری جیسے اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتی ہوئی جا رہی ہو۔

اس کے بعد صادق وٹو کو آہستہ آہستہ اپنی ملازمت اور ذمہ داری کی اہمیت کا ادراک ہونے لگا۔ اس کی نظروں میں اپنے وجود کی قدر و قیمت بڑھ

گئی۔ ایک حکمران کی کار کو روکنے کا عمل اس کے مردہ احساسات کے لئے از حد تقویت بخش تریاق ثابت ہوا اور وہ انگڑائیاں لے لے کر جاگنے لگے۔ چھٹی کے وقت اس نے، خلاف معمول، دوسرے سرے والے سنتری سے بات کی تو معلوم ہوا کہ وہ تو پہلے ہی اپنے کو ڈی۔ سی سمجھتا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ آہستہ خرام گھوڑے کو ایڑ لگی اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

اس واقعے کے بعد پے در پے ایسے واقعات ہوئے جو اس کی مسکین شخصیت کے اندر دبے، کچلے ہوئے وقار اور خود آگاہی کو مزید اجاگر کر گئے۔ ایک دن اس نے خواہ مخواہ جھنڈی ہلا کر ایک ممبر اسمبلی کی کار کو روک لیا۔ اور اُسے رکنا پڑا۔

چند دنوں کے بعد بہاول نگر میں سالانہ میلہ مویشیاں منعقد ہوا، تو اس سلسلے میں ایک ورائٹی شو کا بھی انتظام کیا گیا۔ شو کی رونق بڑھانے کے لئے لاہور کی ایک مشہور فلم ایکٹرس کو دعوت دی گئی۔ اس کی کار بھی اس پُل پر سے گزری۔ صادق وٹو نے بلاوجہ سُرخ جھنڈی ہلا دی۔ کار رُک گئی اور جب تک رُکی رہی، وہ فلم ایکٹریس بڑے خوشامدانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی جیسے کہہ رہی ہو، بھئی اب تو جانے دو۔

اور پھر تو اُس کے اختیارات کے سامنے بے بس ہو جانے والے بڑے لوگوں کی ایک قطار سی لگ گئی۔

ایک دن بھاول نگر کا ڈپٹی کمشنر۔

دوسرے دن محکمہ زراعت کا ایک ڈائریکٹر۔

تیسرے دن کوئی بڑا زمیندار۔

اسمبلی کے ممبر، تک چڑھے، لکھ پتی تاجر۔ بدمزاج افسر۔ کپاس کی خرید کے لئے آنے والے گورے، گورے جاپانی۔ غرض کون تھا جو اس کی سُرخ جھنڈی کے سامنے عاجز نہ تھا۔

اور چند دن پہلے وہ موت کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔

پھر ایک جمعرات تو ایسی آئی کہ صادق وٹو کا اس کے تمام ساتھیوں میں بول بالا کر گئی اور پل کے سارے ملازموں نے اسے ایک دلیر اور جرأت مند آدمی تسلیم کر لیا۔

ہوا یوں کہ شام کے وقت عارف والا کی طرف سے ایک زرد چھت والی ٹیکسی نمودار ہوئی۔ پل کے دوسرے سرے والے سنتری نے سبز جھنڈی ہلا دی تھی چنانچہ صادق وٹو نے ٹیکسی کو روکنے کے لئے سُرخ جھنڈی لہرائی لیکن ٹیکسی کے کوتاہ گردن ڈرائیور نے جس کے صافے میں لپٹے ہوئے چہرے پر صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں اشارے کی کوئی پرواہ نہ کی اور اس خیال سے کہ دوسری طرف کا ٹریفک پل پر چڑھنے سے پہلے، وہ نکل جائے گا، ٹیکسی کو پوری رفتار سے پل پر چڑھاتا چلا گیا۔ لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا، دوسری

طرف سے ایک بس نے پل عبور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ٹیکسی والے کو مجبوراً رکنا پڑا۔ صادق وتو کو سخت غصہ آیا۔ وہ بھاگتا ہوا ٹیکسی کے قریب گیا اور دروازہ کھول کر اس نے ڈرائیور کو اتار لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جبڑوں پر تین چار مکے جڑ دیئے۔ ڈرائیور نے پستول نکال لیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، صادق وتو نے اس کی کلائی پر اپنی سرخ جھنڈی کی ڈنڈی ایسی کاری جمائی کہ پستول ڈرائیور کے ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں جا پڑا۔ اتنے میں پیچھے سے ایک جیپ آکر رکی؛ اس میں سے پولیس کے کئی سپاہی رائفلیں تانے نکلے اور چشم زدن میں انھوں نے ٹیکسی اور ڈرائیور کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ سب کچھ اس برق رفتاری سے ہوا کہ صادق وتو کو کچھ پتہ نہ چلا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو معلوم ہوا کہ اس نے بہاولنگر کے ایک بدنام زمانہ سمگلر کی گرفتاری میں مدد کی ہے، پولیس جس کا تعاقب منٹگمری سے کر رہی تھی، اور جس نے گرفتاری سے بچنے کے لئے ایک غریب ٹیکسی ڈرائیور کو قتل کر کے یہ ٹیکسی ہتھیائی تھی۔

پولیس افسر کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ بار بار صادق وتو کے کندھے پر تھپکی دے رہا تھا۔ آج اگر صادق وتو نہ ہوتا تو بہاولنگر کے سرحدی علاقے کی وہ "بلا" کبھی قابو میں نہ آسکتی جس کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ پولیس بھی اس کا دو بدو مقابلہ کرتے سے گھبراتی تھی۔

"ہم کسی ایسے ہی موقعے کی تلاش میں تھے اور اللہ سے دُعا کر رہے تھے کہ اس بلا کو کسی ایسی جگہ پھنسا جہاں سے یہ نکل نہ سکے۔" پولیس افسر مارے خوشی کے ہکلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اب اس کی ترقی کا چانس بن گیا تھا۔

اور جب اپنی ڈیوٹی ختم کر کے صادق دتّو، حسب معمول ایک بس میں، اپنے گھر روانہ ہوا تو ستلج کے کنارے رہنے والے ملّاح اس کی طرف اشارے کر کر کے، بار بار ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

"منہ تاں ویکھ چھوآر دا۔ شیر دکھیندا آئی کہ ناہیں۔"

(ذرا لڑکے کا چہرہ تو دیکھو۔ شیر دکھلائی پڑتا ہے کہ نہیں۔")

وہ اڈے پر بس سے اُترا اور گھر جاتے ہوئے جب وہ اے۔ڈی۔ایم کی عدالت کے سامنے سے گذرا تو بہاول نگر کے بازاروں میں برقی قمقمے روشن ہو گئے تھے اور رفیق شاہ کے بنگلے کے صدر دروازے پر جگمگاتی ہوئی بجلی کی سبز ٹیوب، ہر طرف سکون کی بارش کر رہی تھی۔ تب صادق دتّو کو محسوس ہوا کہ یہ دُنیا ایک راحت کدہ ہے، جہاں ہر طرف مکمل امن اور گھمبیر شانتی ہے۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو عین دروازے کے آگے حسب معمول، گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ گندگی کے یہ ڈھیر لگانے میں کچھ تو اس کے ہمسایوں کا حصہ تھا اور کچھ میونسپل کمیٹی کا، جس کے گندگی اٹھانے والے ٹرک

نے کبھی اس علاقے کا رُخ نہ کیا تھا۔ اس نے زیرِ لب میونسپلٹی کو ایک موٹی سی گالی دی اور گھروں میں گھُسے ہوئے ہمسایوں سے چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

اب سے کسی نے میرے گھر کے آگے گندگی پھینکی تو میں اس کی ٹانگیں چیر دوں گا۔ ماں کے یار ہتے اپنے گھر ہیں اور ڈال میرے گھر کے سامنے جاتے ہیں۔"

چند ہمسایوں نے اپنی کھڑکیاں ذرا ذرا کھول کر اس بنے آدمی کو دیکھا اور پھر سوچنے لگے کہ بکری کے منہ میں زبان کہاں سے آگئی۔ شاید آج کسی نے پلا دی ہے۔

جب وہ گھر میں داخل ہوا تو چھوٹے سے، اونچی چھت والے، واحد کمرے میں اس کی ساس اور بیوی سر جوڑے کسی کھسر پھسر میں مصروف تھیں اور کھانے کو کچھ تیار نہ تھا۔ گذشتہ اصول کے مطابق، صادق دتّو کو باری باری اپنی ساس اور بیوی کی خوشامد کرنا چاہیئے تھی، تب کہیں ہنڈیا پکنی شروع ہوتی اور آدھ گھنٹے کے بعد کھانا نصیب ہوتا۔ لیکن آج تو وہ ایک معرکہ سَر کر کے لوٹا تھا۔

"کھانا کہاں ہے۔ کھانا لاؤ۔" وہ دھاڑا۔

حزبِ اقتدار کی ترجمان ساس ہی تھی۔ اس نے صادق دتّو کی بات کا جواب دینا کسرِ شان سمجھا۔ چنانچہ اس کی بیٹی بھی خاموش رہی۔ ایک مختصر سے وقفے کے بعد وہ بدستور اپنی کھسر پھسر میں مصروف ہو گئیں۔

"میں کہتا ہوں کھانا لاؤ" وہ گرجا "ورنہ میں کسی تنور پر سے کھا آؤں گا اور آئندہ سے تمہیں روٹی کا خرچ دینا بند کر دوں گا۔"

بڑھیا کچھ حیران سی ہو کر اٹھی اور صحن کی پرلی طرف، چھوٹے سے باورچی خانے سے چند ادھ جلی روٹیاں اور ایک مولی لا کر بڑی بے اعتنائی کے ساتھ اس کے سامنے رکھ گئی۔

"ہوں۔ تو آج بھی کوئی سالن نہیں پکا" وہ غرایا۔ "میں کہتا ہوں یہ مولیوں سے کبھی میری جان چھوٹے گی یا نہیں؟"

"بس یہی ہے گھر میں۔ کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ بھوکے رہو۔ مجھ سے یہ نخرے نہیں سہے جاتے" ماں نے، اپنا غلبہ برقرار رکھنے کی کوشش میں، چلچلا کر کہا۔

صادق دلّو کو وہ تمام وزیر، افسر اور بڑے بڑے زمیندار یاد آ گئے، جو اس کے ایک اشارے کے محتاج تھے۔ اس کے ذہن میں وہ دیو ہیکل ٹرک، زمین کا سینہ دہاتی ہوئی بسیں اور لمبی لمبی کاریں تیرنے لگیں جو اس کی سرخ جھنڈی کے ایک خفیف سے ہلکورے سے رک جاتی تھیں۔ وہ تنتناتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ کا ایک بھرپور جھپٹا مارا۔ مولی اور ادھ جلی روٹیاں دور ایک کونے میں جا پڑیں اور وہ مڑ کر حیرت میں ڈوبی ہوئی ماں سے کہنے لگا۔

"بڑھیا، میرا منہ کیا تک رہی ہے۔ ڈھنگ کی روٹیاں اور گھی میں شکر

ملا کر لا۔ نہیں تو میں تیرا سر پھوڑ دوں گا۔"

بڑھیا نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔ اور بیوی، کچھ تحیر اور کچھ تحسین کی نظروں سے اپنے باغی شوہر کو دیکھنے لگی۔

خوب اچھی طرح پیٹ بھرنے کے بعد صادق دتّو اپنی تین ماہ کی بچی کی طرف متوجہ ہوا، جو بستر پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی۔

"اب اس کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ سونے دو بچی کو۔" ساس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ اب کھویا ہوا تحکم دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

صادق دتّو نے سُنی اَن سنی کر دی، اور سوتی ہوئی بچی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ بچی بے چین ہو کر رونے لگی۔ لیکن جب اُس نے اپنی نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر یہ دیکھا کہ وہ کسی غیر کی نہیں، بلکہ اپنے باپ کی گود میں ہے، تو وہ خود بخود خاموش ہو کر پھر معصوم خوابوں کی وادی میں چلی گئی۔ صادق دتّو نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، ہولے ہولے لوری گنگنانے لگا۔

"نندیا آ جا ری ... تو آ کیوں نہ جا ... میری چھوٹی سی گڑیا کو سُلا کیوں نہ جا۔"

ساس نے ایک بار پھر آواز لگائی۔ "تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ بچی کا نام بگاڑ کر نہ لیا کرو، ورنہ ساری عمر کو بگڑ جائے گا ... اچھا بھلا نام ہے ....

شریفاں بی بی .... پتہ نہیں لوگوں کو نام بگاڑ کر کیا ملتا ہے"۔

صادق وٹو کو یاد آیا کہ خود بڑھیا کے بیٹے کو اس کے گاؤں میں سب لوگ چھترا، چھترا، کہتے ہیں۔ حالانکہ اس کا صحیح نام صدر دین ہے۔

"میں تو اس کو گڈیا ہی کہوں گا۔ نام بگڑے یا بنے"۔ اس نے بڑی احتیاط سے بچی کو واپس اس کے بستر پر لٹا کر، اپنا مستحکم فیصلہ سنایا۔

اس کے بعد، پلنگ پر دراز ہو کر، اس نے لیمپ کا ایک سیگرٹ پیا۔ دو تین بھرپور ڈکاریں لیں اور پھر کپڑے بدل کر، "خان ہوٹل" میں ایک پیالی چائے پینے چلا گیا۔

"خان ہوٹل" شہر کا واحد ہوٹل تھا، جو آدھی رات تک کھلا رہتا تھا۔ بہاولنگر کا سارا مزدور طبقہ، چائے پینے اور گپ شپ اڑانے اسی ہوٹل میں آتا تھا۔ مزدوروں کے علاوہ یہ جیب کتروں، ٹھگ بازوں اور تیسرے درجے کی طوائفوں کے دلالوں کا دلچسپ اڈہ تھا۔ حالانکہ اس ہوٹل کا مالک ایک پابند صوم و صلوٰۃ، باریش پٹھان تھا ــــ اور چائے یا سستے بسکٹوں کے علاوہ یہاں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔

صادق وٹو پہلے بھی کئی بار یہاں آیا تھا۔ بلکہ کسی حد تک وہ اس ہوٹل کا مستقل گاہک تھا۔ لیکن آج اس کی شان ہی نرالی تھی۔ صاف کپڑے۔ گردن میں ایک ہلکا سا خم۔ ہونٹوں میں لیمپ کا سیگرٹ۔ چہرے پر خود اعتمادی اور وقار

کی روشنی۔ چال میں افسروں کی سی اداۓ بے نیازی۔ ہوٹل کے پُرانے گاہکوں نے اچک اچک کر، اسے بڑی حیرت سے دیکھا۔ چند آشنا چہرے جنھوں نے پہلے کبھی اسے کوئی اہمیت ہی نہ دی تھی، بڑے تپاک سے آگے بڑھ کر ملے۔ اور پھر ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ "معلوم ہوتا ہے، کہیں سے چار پیسے آگئے ہیں، جمان کے پاس"۔ وہ کسی کے پاس نہ رُکا اور سیدھا اپنی مخصوص میز، کرسی کی طرف چلا گیا۔ لیکن وہاں ایک موٹے تازے شخص کا قبضہ تھا۔

"یہ کرسی چھوڑ دو اور ادھر چلے جاؤ۔ یہاں میں بیٹھتا ہوں"۔ صادق دتّو نے موٹے تازے شخص سے کہا جو بڑے اطمینان سے پیالی کی چاۓ پرچ میں انڈیل انڈیل کر پی رہا تھا۔

"تو یہاں بیٹھتا ہے، تو کیا میز کرسی اپنے نام الاٹ کروالی ہے؟" موٹے تازے شخص نے چاۓ پیتے ہوۓ کہا۔

صادق دتّو نے زبان ہلاۓ بغیر، اس کو مضبوطی کے ساتھ گردن سے پکڑا اور دھکیلتا ہوا دوسری کرسی پر بٹھا آیا اور ساتھ ہی اسے یہ بھی سُنا دیا کہ "میرے سامنے تو بڑے بڑے افسر کوئی حیثیت نہیں رکھتے، تُو کیا چیز ہے"۔ وہ بیچارہ کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ چپ چاپ اپنی دوسری کرسی پر بیٹھ کر چاۓ پینے لگا۔ اپنی پرانی میز کرسی پر دلیرانہ قبضہ جما کر، صادق دتّو نے بڑا دا

آواز میں چھوکرے کو چائے لانے کا حکم دیا۔

چائے سے فارغ ہو کر وہ ہوٹل سے باہر نکلا۔ ایک پنواڑی کی دوکان سے میٹھا پان کھایا اور ٹہلتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کی ساس، حسب معمول، اپنی بیٹی اور نواسی کے ساتھ سو رہی تھی اور اسے، پُرانے قاعدے کے مطابق، اس تنگ و تاریک کوٹھری میں سونا تھا جو بطور باورچی خانہ استعمال ہوتی تھی۔ یہ ڈھنگ ساس نے اُن دنوں اختیار کیا تھا جب بچی پیدا ہوئی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہ رات کو "زچہ و بچہ" کی دیکھ بھال کرتی چلی آ رہی تھی۔ اور صادق دتّو کبھی اتنی جرأت ہی نہ کر سکا تھا کہ ساس کو کم از کم اپنے "حقوقِ زناشوئی" میں مداخلت کرنے سے روک سکتا۔ لیکن آج گھر جاتے سمے اس نے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ساس کو اپنے کمرے سے نکال باہر کرے گا اور اگر اس نے کوئی حیل حجت کی تو اس کی پٹائی کرنے سے بھی ہرگز گریز نہ کرے گا۔

"اور کل انشاء اللہ حرام زادی کو واپس گاؤں روانہ کر دوں گا۔" چلتے چلتے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "سالی، پوت کی جوتیاں کھائے گی تو دماغ درست ہو جائے گا۔"

جب وہ گھر کے اندر گھسا تو اسے ساس کے خرّاٹے سنائی دیئے۔ خرّاٹوں کی منحوس صدا نے اس کے غصے کو اور ہوا دی اور وہ کمرے میں داخل

ہمستے ہی پوری قوت سے دھاڑا،

"نکل جاؤ یہاں سے۔"

بڑھیا اور اس کی بیٹی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔

"میں کہتا ہوں نکل جا یہاں سے کمینی بڑھیا۔ میں آج اپنے کمرے میں سوؤں گا۔" اس کی آواز میں بجلی کی کڑک تھی۔

بڑھیا سرد و گرم چشیدہ تھی۔ سمجھ گئی کہ آج سویا ہوا شیر جاگ اٹھا ہے۔ خاموشی سے اٹھی اور اپنا بستر سمیٹنے لگی۔

"اور کان کھول کر سن لو کہ کل یہ بستر ہمیشہ کے لئے میرے گھر سے گول ہو جائے۔" اس نے ساس کے لپٹے ہوئے بستر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں اب تمہارا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے بیٹے کے پاس جاؤ، وہ تمہاری اچھی طرح خدمت کرے گا۔"

ساس صورت حال کی نزاکت تو بھانپ ہی چکی تھی۔ اس لئے اس نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ اپنا بستر اٹھا کر باورچی خانے والی کوٹھری میں چلی گئی۔

"اور تم بھی کان کھول کر سن لو۔" ساس کے بعد اب صادق ودو اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ "یہ میرا گھر ہے۔ میں اس گھر کا مالک ہوں۔ یہاں میرا حکم چلے گا۔ تمہاری ماں کا نہیں اور صبح اسے تم بھی کہہ دینا کہ وہ یہاں سے چلی جائے، ورنہ

میں مار مار کر نکال دوں گا۔ سنا؟"

"جی۔" زندگی میں پہلی بار بیوی نے اپنے شوہر کو مودبانہ جواب دیا۔

صادق وٹو نے چونک کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

"شیداں . . . ." اس نے ایک بار پھر اپنی بیوی کو پکارا۔

"جی۔" وہی مودّب جواب ملا۔

وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے جھپٹ کر شیداں کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور اسے اتنا چوما، اتنا چوما کہ اس کے رخساروں اور ہونٹوں پر نیل پڑ گئے اور اس کی آنکھوں میں خمار ناچنے لگا۔

اگلے دن جب وہ علی الصباح سو کر اُٹھے تو بڑھیا شاید پہلی بس سے ہارون آباد جا چکی تھی۔ باورچی خانے والی کوٹھری میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ صادق وٹو نے کام پر جانا تھا۔ وہ جلدی، جلدی نہایا دھویا۔ اتنے میں شیداں نے ناشتہ تیار کر لیا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے بچّی کو پیار کیا اور بسوں کے اڈّے پر چلا گیا اور بس پر سوار ہو کر بڑے اطمینان سے اپنے کشتیوں کے پل کو روانہ ہو گیا۔

لیکن وہاں پہنچ کر اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ پل کے دونوں سروں پر راتوں رات سبز اور سرخ بتیوں والے آٹومیٹک سگنل نصب ہو چکے ہیں اور . . . . اس طرف والے سگنل کی سُرخ آنکھ نے اس کا راستہ روک رکھا ہے ٭

# درد آئے گا دبے پاؤں

آج اگر میں یہ بتاؤں کہ چھ سات برس پہلے شہاب کیا تھا۔ تو لوگ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن مجھ سے بہتر اسے کون جان سکتا ہے؟ اس کا گھر، میرے مکان کے عین سامنے تھا۔ اور ہمارے دروازوں کا درمیانی فاصلہ بمشکل آٹھ گز تھا۔ اس کی بہن "شاہدہ" میری بہن کی سہیلی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب شاہدہ ہمارے ہاں نہ آتی ہو یا میری بہن اس کے گھر نہ جاتی ہو۔ ایک زمانہ تو ایسا بھی آیا تھا جب میں شاہدہ کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا...... وہ تھی بھی بہت پیاری لڑکی۔ اتنی پیاری لڑکی۔ اتنی پیاری کہ مجھ ایسے لڑکے کے اعصاب پر بھی سوار ہو گئی۔ میں جو بچپن سے ہی ناساعد حالات کے باعث ان روشن لمحوں سے محروم رہا ہوں جب نظر کسی کے حسن سے ہمکنار ہوتی ہے اور دل

اور آئے گا دبے پاؤں۔

کسی کی یاد سے ہمکلام ہوتا ہے.... شاہدہ کا بوٹا سا قد اور گداز جسم مجھے آج بھی یاد ہے..... اس کی آواز میں آسمانی گیتوں کی ترنگ تھی۔ اس کے رخساروں کے شفق زاروں کو ابھرتا ڈوبتا سورج سلام کرتا تھا۔ اور اس کی شمعی انگلیاں جب پیانو پہ سُروں کا جادو جگاتی تھیں تو کم از کم مجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے یہ پوری کائنات اعجازِ طلسم کے سوا کچھ بھی نہیں۔

شہاب ان دنوں بی۔ایڈ میں پڑھتا تھا۔ اور میں ایم۔اے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے تعلیم کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر کے اپنی آئندہ زندگی کی راہ متعین کر لی تھی اور میں حسبِ معمول، سامنے آنے والے کسی بھی راستے پر چلنے کے لئے تیار تھا۔ اس سے بے نیاز کہ وہ راستہ کون سی وادی میں جا نکلے گا کون سی منزل پر ختم ہو گا۔ میں نے نتائج کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ یہ لکھ رہی نہیں ہوں۔ لیکن طبیعت کا سانچہ کچھ اس طرح تشکیل پا چکا ہے کہ عواقب و عواطف میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں ان اہلِ جنوں میں سے ہوں جن کے لبوں پہ حرفِ غزل مچلتا ہے۔ جن کے دلوں میں قندیلِ غم فروزاں رہتی ہے جو وہاں تک جاتے ہیں جہاں تک قدم لے جائیں۔ جو تاریک راہوں پر مارے جاتے ہیں اور اس وقت بھی شکوہ نہیں کرتے جب شوق کے تمام سلسلے ہجر کی قتل گاہوں سے جا ملتے ہیں۔

شہاب ایک خوب صورت لڑکا تھا۔ گھنی پلکوں اور سیاہ گھنگریالے بالوں

والا لڑکا اس کے چہرے کو دیکھ کر اس زرد گلاب کا خیال آتا تھا جو بارانی رات کے بھیگے بھیگے لمحوں میں کھلا ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ کچھ تلاش کرتی ہوئی، انجانی گہرائیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، وہ بڑی عمدگی، بڑے وقار سے بات کرتا تھا۔ زندگی کے ساتھ اس کا ہر معاملہ یہاں تک کہ اس کا لباس بھی اسی عمدگی اور وقار کا حامل تھا۔ وہ واقعی ایک غیر معمولی لڑکا تھا اور اسے اپنے بدن اور اپنی روح دونوں کا مکمل محاسبہ کرتے اور انھیں حدود کے اندر رکھنے کی بے پناہ قوت حاصل تھی۔ شاید اسی قوت کو ضبط نفس کی صلاحیت کہتے ہیں۔ بعض اوقات اسے اپنا کوئی سبق رات کو یاد نہ ہوتا تو وہ علی الصبح اُٹھ بیٹھتا اور جب تک وہ مشکل سبق از بر نہ ہو جاتا، اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتا۔ وہ بلا شبہ ان جری انسانوں میں سے تھا جو انسان کی اکملیت پر یقین رکھتے ہیں جن کے لئے کون ومکان کا کوئی مسئلہ انسانی دسترس سے باہر نہیں ہوتا۔ زندگی کی جولانگاہ میں جب تک ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے ، ندیم کا یہ مصرعہ میرے ذہن میں گونجتا رہا۔

انسان عظیم ہے خُدایا

جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ ہم دونوں کے لئے معاشی اعتبار سے بڑا صبر آزما دور تھا۔ لیکن اس دور میں بھی اس کا اعتقاد تھا۔ کہ وہ دن آنے والا ہے۔ جب معاش کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔

"میرا ایمان ہے۔ کہ میں مفلس نہیں رہوں گا۔ میرے پاس ایک نہ ایک دن، اتنی دولت آجائے گی۔ کہ میں ساری دُنیا کا سفر کر سکوں" وہ کہا کرتا تھا۔

اور آپ مانیں نہ مانیں، اس نے اس طویل سفر کی تیاری کے سلسلے میں بیک وقت فرانسیسی، جرمن، روسی، عربی اور سیکنڈے نیوین زبانیں سیکھنی شروع کر دی تھیں۔ جب کہ اس زمانے میں مجھے انگریزی زبان پر بھی پورا عبور نہیں تھا اور ایم اے میں پڑھنے کے باوجود میں انگریزی گرامر کی فاش غلطیاں کیا کرتا تھا۔

"زندگی کا پہلا سبق یہ ہے کہ کام کرو" وہ مجھ سے کہا کرتا تھا: انتھک کام، سُستی اور کاہلی انسان کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے"۔

اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ کہ جب انگریزی کا مشہور شاعر، کیٹس اپنی طبیعت کو لکھنے پڑھنے کی محنت پر آمادہ نہ پاتا تو تازہ پانی سے غسل کرتا اور نئے کپڑے پہن کر یوں تیار ہوتا جیسے اسے کسی تقریب میں شرکت کرنے جانا ہو۔ اس طرح اس کی کسل مندی دور ہو جاتی اور وہ پھر نئے ولولے کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ شہاب نے اکثر مجھے مشورہ دیا تھا کہ اپنی کسلمندی دُور کرنے کے لئے میں بھی کیٹس کا یہ نسخہ استعمال کروں۔ کیٹس واقعتاً اُس کا آئیڈیل ہی نہیں دیوتا تھا۔ اور انگریزی شاعری سرے سے اپنی سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی البتہ کبھی کبھی جب میں زندگی کی مسلسل جدوجہد سے اُکتا جاتا تو دل کو بہلانے کے لئے اختر شیرانی اور کیٹس کے فن پر اکثر بحث چھیڑ دیتا۔

شہاب اسی اعتماد اور وقار کے ساتھ کہتا:

"بات دراصل یہ ہے پیارے کہ اختر شیرانی عظیم شاعر نہیں ہے۔"

"وہ عظیم شاعر ہو یا نہ ہو" میں جواب دیتا۔ "لیکن اس کے شعروں میں ایک دردمند دل ضرور دھڑکتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک"۔ اس کے لبوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ پھیل جاتی۔ "میں مانتا ہوں لیکن جس طرح بدن کی ہر حرکت فنِ رقص نہیں ہے، ہر آواز کو موسیقی نہیں کہا جاتا، محض رنگ و خطوط کا اجتماع مصوری نہیں کہلاتا، اسی طرح محض دردمند دل کی پکار شاعری نہیں ہو سکتی۔ شاعری بھی فنون کی بنیادی قدروں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور فن کی بنیادی قدروں میں سے ایک اہم قدر تنظیم و ترتیب ہے۔ اختر شیرانی کی طرح کیٹس بھی ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ لیکن کیٹس نے اپنے دردمند دل کی پکاروں کو تنظیم و ترتیب کا حُسن بخشا ہے۔ اسی حُسن نے اس کی شاعری کو عظیم بنایا ہے۔ اس کے برعکس اختر شیرانی کے ہاں دل تو ہے لیکن وہ اس دل کے نالوں کو حسنِ تنظیم و ترتیب نہیں دے سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پراگندہ خیالی اور بیمار رومانویت کا شاعر بن کر رہ گیا جبکہ کیٹس ......"

"چھوڑو یار یہ کیا کیٹس کیٹس کی رٹ لگا رکھی ہے۔" میں جھنجھلا جاتا۔ "اردو میں بھی تو اختر شیرانی کے علاوہ کئی عظیم شاعر ہیں مثلاً میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ۔"

ہاں ہاں میں نے کب انکار کیا ہے" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے کہتا "میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ واقعی اُردو کے عظیم شاعر ہیں۔"

"یہ نام تو میں نے تمہیں انگریزی سے اُردو کی طرف لانے کے لئے دہرائے ہیں ورنہ اُردو نے ان کے علاوہ بھی کئی شاعروں کو جنم دیا ہے۔ فراقؔ، جوشؔ، اور فیضؔ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"فراقؔ واقعی عظیم شاعر ہے" وہ کہتا "جوشؔ کی عظمت میں مجھے کچھ کچھ شک ہے۔ اور فیضؔ کو تو میں قطعاً عظیم شاعر نہیں مانتا۔ اس کی شاعری کو بہت جلد بھلا دیا جائے گا۔ اور وہ ہے بھی اس قابل کہ اس کو بھلا دیا جائے۔"

"تم نے بہت جلد اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ آخر فیضؔ بے چارے نے ایسا کونسا جرم کیا ہے کہ تم اسے عظیم شاعر ماننا تو کجا، اُردو کی شعری روایت سے ہی محو کئے دے رہے ہو۔"

"ہاں، فیضؔ کے بارے میں میری جچی تُلی رائے یہی ہے کہ وہ ایک ہنگامی شاعر ہے۔ جسے وقت کی ایک تیز رو نے سطح پر اُبھار دیا ہے۔ ایک دور آئے گا کہ لوگ اس کو بھول جائیں گے۔ "نقشِ فریادی" تک اس کی شاعری میں تازگی تھی۔ آگے بڑھنے کی دُھن تھی۔ لیکن "دستِ صبا" کے دور میں ایک تھکی تھکی سی کیفیت ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے فیضؔ کو شاعری سے سرِ یا ہے سی دلچسپی باقی رہ گئی ہے۔ فیضؔ نے ایک مخصوص نظام زندگی کی راہ میں قید و بند کے مرحلے

بھی جلے گئے اور دار و رسن تک پہونچنے کا حوصلہ بھی دکھایا لیکن اس کی شاعری،
ایک محرک کی شدت میں اضافے کے باوجود، قوالی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

چلے ہیں جان و ایمان آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکر اغیار و اعدا، ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

اس قسم کی قوالیاں لکھنے والا اور تو سب کچھ ہو سکتا ہے، اعظم شاعر نہیں ہو سکتا۔
لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" مجھے شہاب کو چڑانے میں لطف آتا تھا
"کسی بھی شاعر کے ہاں جب کوئی مخصوص نظریۂ زندگی مقصد کا مقام حاصل کر لیتا
ہے تو لامحالہ فن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ کیا یہ حادثہ اقبالؔ اور حالیؔ کے
ساتھ نہیں گزرا؟۔ مگر اس سے ان کی عظمت میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔"

"یہ درست ہے" شہاب نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔ "لیکن تم نے یہ
بات کیوں نظر انداز کر دی کہ حالیؔ اور اقبالؔ نے جس نظریۂ زندگی کو اپنا مقصد بنایا
اس کی جڑیں ہمارے معاشرے کی گہرائیوں میں تھیں۔ فیضؔ جس نظریہ کی تبلیغ
کرتا ہے وہ ہمارے معاشرے کے مزاج کے خلاف ہے۔ ہم بنیادی طور پر
مذہبی لوگ ہیں اور اشتمالیت کی راہ ہمیں مذہب سے دور لے جاتی ہے۔"
"اشتمالیت ہمیں مذہب سے دور لے جائے یا نزدیک لائے بہر حال
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فیضؔ زبانِ شعر میں جو کہتا ہے سچ کہتا ہے۔"

"بھئی میں کب کہتا ہوں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچ جو ہماری زندگیوں سے مطابقت نہ رکھتا ہو ہمارے کس کام کا۔"

اس کے بعد ہماری بحث کا دائرہ، معروضیت اور موضوعیت تک پھیل جاتا۔ ہم دو بے وقوف لڑکے آپس میں جھگڑتے رہتے، اور ہمارے چاروں طرف، دریائی جھاڑیاں اپنی مخصوص مہک اڑاتی رہتیں اور دریا کے پُل پر سے لوگوں کا ہجوم گزرتا رہتا اس ہجوم میں آہو چشمان شہر کے غول بھی ہوتے اور ان سوگوار انسانوں کے گروہ بھی جو اپنی آنکھوں میں ناکامیوں اور نامرادیوں کی پیلاہٹیں لئے سر جھکائے، چپ چاپ گزر جاتے لیکن ہم ان سے بے خبر بحث میں مصروف رہتے۔ حتیٰ کہ میں اُکتا کر کوکا کولا یا چائے کی فرمائش کرتا لیکن شہاب کو ڈرنکس (DRINKS) پر اپنے پیسے ضائع کرنے سے بڑی چڑ تھی۔

"اس شہر کے لوگ ڈرنکس کے لئے دولت بھی ضائع کرتے ہیں۔ اور وقت بھی۔" وہ کہا کرتا تھا۔ "یہ لوگ چائے کی پیالیوں میں طوفان اٹھاتے رہتے ہیں حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے معمولات کو منظم کریں اور بے پناہ محنت کریں۔ تنظیم اور کام — یہ وقت کی آواز ہے۔"

اور پھر یوں ہوا کہ شہاب بی۔ایڈ کرنے کے بعد ایک ہائی سکول میں ٹیچر ہو گیا اور مجھے ایک امریکن انشورنس کمپنی میں معقول ملازمت مل گئی۔ اور

ہم ایک دوسرے سے دُور ہوتے گئے۔ اس دوری کی وجہ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں تھا۔ بس یوں تھا کہ مجھے محفلیں پسند تھیں اور شہاب کو تنہائیاں راس آتی تھیں۔ میری انجمن آرائیوں نے مجھے لاابالی، بے پروا، اور آزاد منش لڑکوں کے گروہ میں لا پھینکا۔ طالب رحمانی، یوسف، منوّر اور میں رات گئے تک کافی ہاؤس میں بیٹھے رہتے اور اپنے معدوں میں سیاہ کافی کی پیالیاں، انڈیل، انڈیل کر کائنات کا مستقبل سنوارنے کے نقشے مرتب کیا کرتے۔ کبھی کبھی شہاب بھی ان محفلوں میں شریک ہو جاتا۔ لیکن جب طالب رحمانی اپنا کوئی طویل رُومانی افسانہ سُناتا شروع کرتا تو شہاب کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں اُبھر آتیں اور جب میں اسے الوداع کہنے کافی ہاؤس سے باہر آتا تو وہ مجھ سے کہتا۔

"تمہارے یہ دوست باتیں بنانے کے علاوہ بھی کوئی کام کرتے ہیں یا نہیں آخر یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ زندگی، یوں بے مصرف لٹانے کے لئے تو نہیں ہے۔"

"کوئی فکر نہ کرو شہاب" میں کھسیانا سا ہو کر جواب دیتا۔ "انقلاب آرہا ہے بدل ہی دیں گے نظامِ دوراں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی۔"

"اگر تاریخ کوئی چیز ہے" وہ بگڑ کر کہتا۔ "تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اور تمہارے ان دوستوں ایسے آوارہ ساتھی آج تک نظامِ دوراں نہیں بدل سکے۔

یہ کہہ کر وہ سڑک کے رواں، دواں، ہجوم میں گم ہو جاتا اور جب میں واپس کافی ہاؤس میں آتا تو، یوسف بُرا سا منہ بنا کر کہتا۔

"یار یہ حقیقت تھی یا میں خواب دیکھ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ ابھی ابھی ایک ایسی مخلوق تھی، جو ماں کے پیٹ میں بھی تیوریاں چڑھاتی رہتی ہے۔"

اور پھر کافی ہاؤس ہمارے قہقہوں سے گونج اٹھتا اور لوگ مڑ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگتے۔

شاہدہ سے بھی اب شاذ و نادر ہی ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی یونیورسٹی بس اسٹاپ پر، کتابیں تھامے مل جاتی، تو کہتی۔

"ہائے اللہ ندیم، ہمارے لئے تو تم اب بالکل اجنبی ہوتے جا رہے ہو۔ پتہ نہیں کہاں کہاں گھومتے رہتے ہو، کبھی ملتے ہی نہیں۔"

"میں بڑی ندامت محسوس کرتا اور جونہی شام کے سائے گہرے ہونے لگتے، میرے قدم خود بخود شہاب کے گھر کی طرف اٹھ جاتے۔ یہ وہ دن تھے جب شہاب مذہب کا بالاستیعاب مطالعہ کر رہا تھا۔ اور اس کے دل و دماغ کو شدید مذہبی رجحانات اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے شاہدہ کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور اسے پردے میں بٹھا دیا۔ وہ اب شہاب کی موجودگی میں، میرے سامنے بھی نہ آتی تھی۔ (ایک پاگل کی وجہ سے بیچاری کی یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری رہ گئی..... میں بھنا کر سوچتا۔)

لیکن بہت دنوں کے بعد ایک صبح جب شہاب سے اچانک ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اب مذہب سے کچھ اکتایا، اکتایا سا ہے۔ اس دن اس نے مذہب کے بارے میں خلاف معمول کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور رسمی سی گفتگو کے بعد ہماری یہ مختصر سی ملاقات ختم ہو گئی۔

اسی صبح کی شام کو جب میں معمول کے مطابق، کافی ہاؤس گیا تو یوسف نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا:

"یار اس دن وہ جو تمہارے ساتھ عجیب و غریب مخلوق تھی وہ، آجکل کہاں ہے؟"

"کیوں؟"

"میں نے آج دوپہر اس کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اس نے کہیں ڈرنک تو شروع نہیں کر دی؟"

"کیا بات کرتے ہو یار، وہ تو سخت مذہبی آدمی ہے۔"

"اچھا"۔ یوسف نے یوں کہا، جیسے میری بات کا اسے یقین نہ آیا ہو۔

کافی ہاؤس میں ہم رات کے گیارہ بجے تک چوکڑی جمائے بیٹھے رہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا، تو گیارھویں رات کے چاند کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اور شہر کے کوچہ و بازار میں از حد مضمحل اور پژمردہ سی

چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ جب میں اپنی گلی میں مڑا تو میں نے دیکھا کہ مجھ سے دس پندرہ گز آگے ایک انسانی ہیولی، دیواروں کے سائے میں، شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا جا رہا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ لڑکھڑاہٹ کے باوجود، مجھے اس کی چال سے شہاب کی شباہت آئی مگر میرے ذہن میں یوسف کا وہ فقرہ گونج گیا..... "اس نے کہیں ڈرنک تو نہیں شروع کر دی؟" مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اتنا ذہین اور محنتی لڑکا جسے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے، ان راہوں پر کیوں چل نکلا ہے جو تباہی کے دہانے پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ کہاں مذہبی کتابیں اور کہاں شراب..... دو مختلف سمتیں..... دو کنارے، جو آپس میں کبھی نہیں مل سکتے..... لیکن شہاب، یکایک، ایک کنارے سے چھلانگ کر، دوسرے کنارے پر کیوں آ گیا ہے؟ - یہ سوال مجھے رات بھر پریشان کرتا رہا۔

اگلے دن ناشتے سے فارغ ہوتے ہی، میں شہاب کے ہاں جا پہنچا۔ لیکن وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ شاہدہ گھر میں موجود تھی۔ میری آواز سن کر وہ بیٹھک میں آ گئی۔

"کیوں پردہ چھوڑ دیا کیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" اس نے ازحد خوش مزاجی سے جواب دیا۔ "بھائی جان کے سر پر جو بھوت سوار تھا، وہ اتر چکا ہے مذہب نے انھیں سخت مایوس کیا ہے۔"

"عجیب آدمی ہے یہ تمہارا بھائی بھی! میری اس کی دوستی کا عرصہ کم از کم دس سال ہے۔ لیکن میں اسے آج تک نہیں سمجھ سکا۔ اچھا یہ بتاؤ۔ آج کل اس کے حال چال کیا ہیں۔ مجھ سے تو اس نے اب ملنا، جلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میرا ایک دوست ملا تھا۔ کہتا تھا کہ ان دنوں شہاب بہت کمزور ہو گیا ہے"

"ہاں کمزور تو ہو گئے ہیں۔ ساری ساری رات نہ جانے کونسی کتابوں میں سر کھپاتے ہیں۔ دن کو بھی بہت کم سوتے ہیں۔ اسکول سے واپس آتے ہیں تو دس بیس شاگردوں کی کھیپ ساتھ ہوتی ہے۔ کھانا کھا کر ان کے ساتھ کہیں باہر نکل جاتے ہیں۔ اس طرح کمزور نہیں ہوں گے تو کیا رستم بنیں گے؟"۔

شاہدہ کے اس جواب نے مجھے مطمئن کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتا دیتی۔

ملک کے سیاسی حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ ہر طرف طوائف الملوکی ابتری اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ ایسے ایسے لوگ برسرِ اقتدار آ گئے تھے کہ عام حالات میں ان کے منہ پہ تھوکنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب ایک نئی وزارت حلف نہ اٹھاتی ہو۔ اور کوئی رات ایسی نہ جاتی جب اسی وزارت کا تیا پانچہ نہ ہو جاتا ہو۔ ایک مضبوط

خفیہ ہاتھ، اپنے اقتدار کے لئے پورے ملک کی سالمیت داؤ پر لگائے بیٹھا تھا۔ خوف اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص نظر چرا کے اور جسم و جان بچا کے چلتا تھا۔ وطن کی ہر صبح داغ داغ طلوع ہوتی اور ہر شام خون میں نہا کے نکلتی اور ہر رات فقیروں کا ماتمی لباس اوڑھ کر آتی۔

ایسی ہی ایک رات کا ذکر ہے ہیں، یوسف، منوّر اور طالب رحمانی کافی ہاؤس کے باہر کھڑے تھے۔ تھکی تھکی اُداس اُداس چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس چاندنی میں ہر شخص پتھر کا مجسمہ دکھائی پڑتا تھا۔ سرد، بے جان اور بے حس۔ شاید ایسی ہی رات تھی جب پومپی آتی زمین میں دھنس گیا تھا۔ بغداد کے آخری خلیفہ کو بیش قیمت قالین میں لپیٹ کر بدمست ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندڈالا گیا تھا۔ اور روم کو شعلوں کے سپرد کر کے نیرو نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر، بنسری بجائی تھی۔ ہم چاروں خاموش تھے۔ جیسے کسی اَن دیکھی قوت نے ہم سے زبانیں چھین لی ہوں اور ہماری زبان کو حرکت کرنے سے منع کر دیا ہو۔ میں نے سیگرٹ سلگایا اور زندگی کے اس بے پناہ کنفیوژن کے بارے میں ازحد دکھ سے سوچا۔

"وہ دیکھو" معاً منوّر نے اپنی لمبی، مخروطی انگلی سڑک کی طرف اٹھادی۔ اس کی آنکھوں میں فضا کا خوف لرز رہا تھا۔

ہم سب نے چونک کر سڑک کی طرف دیکھا۔ پرلی جانب کی فٹ پاتھ پر سے

شہاب، دس بیس، نوعمر لڑکوں کے جلو میں، شہزادیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس نے ایک لمبا اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر سیاہ جناح کیپ تھی۔ وہ لڑکے شاید اس کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا اور وہ ہماری نظریں ایک تاریک گلی کے نکڑ تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ گلی میں مڑنے کے بعد وہ اور اس کے شاگرد غائب ہو گئے۔ کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرا دل اچھل کر حلق میں آیا چاہتا ہو۔

وہ رات مجھ پر بہت گراں گزری۔ عجیب آسیب زدہ سی رات تھی ہر آدھ گھنٹے کے بعد میری نیند ٹوٹ جاتی اور میں ہڑبڑا کر اپنے بستر پر اُٹھ بیٹھتا۔ ایسے ہی ایک وقفے میں جب آنکھ کھلی تھی تو میں نے اپنے مکان کے دروازے پر ایک بھاری ہاتھ کی دستک سُنی۔ میں جلدی سے باہر نکلا سفید کپڑوں میں ملبوس ایک طویل قامت شخص میرا انتظار کر رہا تھا۔ دم توڑتی ہوئی چاندنی میں اس کے چہرے کے نقوش کچھ مسخ سے دکھائی پڑ رہے تھے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مردہ، کالے جادو کے زیر اثر، اپنی قبر سے نکل کر مجھے بُلانے آ گیا ہو۔

"تمہارا نام ندیم ہے؟" اس نے کسی تمہید کے بغیر کھٹ سے سوال کر دیا۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

"جی ہاں"۔ خوف کے باوجود، میں نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔

"تم شہاب کے بہت گہرے دوست ہو؟"

"جی ہاں"۔

"اُسے سمجھاؤ۔ وہ آگ سے کھیل رہا ہے۔ اس نے طالب علموں میں حکومت کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے اسے کہہ دو کہ اگر اس نے اپنا طرزِ عمل یہی رکھا تو اس کا بہت بُرا حشر ہوگا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر وہ کفن پوش مردہ گلی کے پیچ و خم میں غائب ہو گیا اور میں کئی لمحوں تک حیران و ششدر، ساکت و جامد اپنی دہلیز پر کھڑا رہا۔

اس کے بعد میں نے کئی بار شہاب سے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ مجھے نہ مل سکا۔ شاہدہ بھی اس کے بارے میں بہت پریشان تھی۔ اس کو بھی اسی قسم کی وارننگ مل چکی تھی۔

اور تب ایک دن شاہدہ نے مجھے بتایا کہ شہاب گرفتار ہو گیا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ اس کو کون سے شہر کی جیل میں رکھا گیا ہے۔ زندگی روز بروز مشکل ہوتی جا رہی تھی۔

شاہدہ شہاب کے بعد، اپنے گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ میں نے اپنی بہن سے کہا۔ وہ اسے اپنے ہاں لے آئی۔ شہاب کی گرفتاری نے اس کے دل و

دماغ پر بُرا اثر ڈالا تھا اور وہ یوں مضمحل سی ہو کر رہ گئی تھی جیسے لُو کے جھونکے سے گلاب کی پتی کھملا کر رہ جائے۔ اس کی باتوں میں تلخی آ گئی تھی۔ شہاب کا کوئی اتا پتہ نہیں ملتا تھا۔ میں نے سر توڑ کوشش کی کہ، کم از کم، اس جیل کا پتہ چل جائے جہاں اس کو رکھا گیا ہے۔ لیکن میری ہر کوشش ناکام ہو گئی۔

کئی دنوں کی ذہنی کشمکش کے بعد، ایک صبح، ڈاک میں، ہمیں ایک خستہ سا کٹا پھٹا، لفافہ ملا۔ جس پر کئی اجنبی مہریں ثبت تھیں۔ ہم ناشتہ کر رہے تھے۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چائے کی پیالی کو پرچ میں ٹکایا اور جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ شہاب کا خط تھا۔ اسے لاہور کے قلعے میں محبوس رکھا گیا تھا۔ اور اب وہ ملتان سنٹرل جیل میں تھا۔ اسے پہلی دفعہ، خط لکھنے کی اجازت ملی تھی۔ اس نے شاہدہ کی خیریت دریافت کی تھی۔ ان رسمی باتوں کے بعد اس نے صرف فیض کی ایک نظم "اے دل بے تاب ٹھہر" لکھ بھیجنے پہ اکتفا کیا تھا۔

..............

مات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو

یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر

صبح ہونے ہی کو ہے، اے دل بیتاب ٹھہر

اور پھر:

..........................

..........................

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
وہ گرانباریٔ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

اس خط میں واضح طور پر کچھ لکھنے کی بجائے شہاب نے جو فیض کی یہ نظم لکھ بھیجی تو مجھے بھی بے اختیار فیض کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے درد دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیرِ ذکرِ وطن سے پہلے

اور اس کے ساتھ ہی مجھے وہ دن یاد آ گیا۔ جب شہاب نے کہا تھا۔

"ہاں فیض کے بارے میں میری جچی تلی رائے ہے کہ وہ ایک ہنگامی شاعر ہے، جسے وقت کی ایک تیز رَو سطح نے اُبھار دیا ہے۔ ایک دور آئے گا کہ لوگ اسے بھول جائیں گے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے لفافہ شاہدہ کے حوالے کر دیا۔ جسے ایک عرصہ کے بعد اپنے گم شدہ بھائی کی خبر ملی تھی۔

اس کے بعد ہمیں مسلسل شہاب کے خط ملتے رہے۔ اور ہر خط میں وہ واضح طور پر کچھ لکھنے کے بجائے فیض کی کوئی نظم یا غزل لکھ بھیجتا تھا۔ وہ جو اپنی زبان میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا، فیض کی زبان میں سب کچھ کہہ جاتا تھا۔ اور سنسر والے، اپنی جہالت کے طفیل، یہ سب کچھ ہم تک اور ان سب تک جن کو شہاب مخاطب کرتا تھا، پہنچا دیتے۔ وہ بیچارے رخسار کے خم اور کاکل کی شکن کی زبان کیا سمجھیں؟

سال گزرتے رہے اور آخر وہ دن بھی آگیا، جب بادِ صبا نے اپنے وعدہ و پیمان پورے کئے اور اہلِ قفس کی آنکھ صبحِ چمن میں کھلی۔ تاریکی غازۂ رخسارِ سحر بن گئی۔ شب سستِ موج کو ساحل مل گیا اور سفینۂ غمِ دل انقلاب کے کنارے آن لگا۔ زندانوں میں زنجیریں مچلیں اور مچل کر ٹوٹ گئیں۔

میں شہاب کو لینے ملتان گیا۔ جب وہ جیل سے باہر نکلا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تھی۔ میں نے لپک کر اس کو گلے سے لگا لیا۔

"یار آخر تم رہا ہو ہی گئے۔ ہم تو دل چھوڑ بیٹھے تھے۔" دفورِ جذبات سے میری آواز کانپ رہی تھی۔ وہ خاموش تھا۔

"یار بہت ظالم تھے وہ جنھوں نے تمھیں جیل میں ڈالا۔" میں بدستور جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا:

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار رکھتے رہے

میں ہنس پڑا۔

"اور کچھ ہوا یا نہ ہو، البتہ جیل نے تمہیں فیضؔ کا شیدائی بنا دیا ہے۔"

اور پھر رات کی ٹرین سے ہم دونوں اپنے شہر لوٹ آئے۔

زندگی ایک بار پھر معمول پر آگئی رواں دواں ہو گئی۔ میں، منور، یوسف، اور طالب رحمانی پھر کافی ہاؤس میں محفلیں جمانے لگے قہقہوں کو نئی زندگی مل گئی۔ لیکن میں کچھ اداس، اداس تھا۔ شاہدہ شہاب کی رہائی کے بعد اپنے گھر چلی گئی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا، جیسے مجھ سے میری عزیز ترین متاع یک بیک چھین لی گئی ہو۔ اگرچہ وہ مجھ سے دور نہیں تھی۔ میں چند قدم چل کر اس کے قریب جا سکتا تھا۔ اس سے باتیں کر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، جب میں اپنے گھر میں داخل ہوتا تھا تو محسوس ہوتا تھا جیسے یہ گھر نہیں ایک دشتِ تنہائی ہے اور اس دشتِ تنہائی میں اس کی آواز کے سائے لرزاں ہیں، اس کے پہلو کے سمن اور گلاب کھل رہے ہیں۔

شہاب سے حسبِ معمول کئی کئی دن ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ وہ عموماً سارا سارا دن گھر سے غائب رہتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں اب مجھے بار بار اس کے گھر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

ایک اتوار کی صبح میری طبیعت بہت کسلمند تھی۔ کہیں جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے سوچا کہ یوں خالی بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ چل کر شہاب سے گپیں ہانکی جائیں۔ یہ دو قدم ہی تو ہے اس کا گھر۔ چنانچہ میں نے سلیپر پہنے اور اس کے ہاں چلا گیا۔ وہ ابھی تک بستر پر دراز تھا۔ اور اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا:

"اب تو تم ہمارے لئے عنقا ہو گئے ہو۔"

"جناب، عنقا میں نہیں ہوا، تم ہو گئے ہو۔ اتنی دفعہ تمہارے گھر آیا۔ لیکن تم تو جیل سے کیا ہو آئے کہ اب گھر میں ٹکتے ہی نہیں۔ دوبارہ جیل جانے کا ارادہ ہے کیا؟"

وہ ہنس پڑا۔ اتنے میں شاہدہ اپنے دوپٹے کے پلّو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی آگئی۔ وہ شاید آٹا گوندھ کر آ رہی تھی۔

"آہا آج آپ کہاں بھول پڑے۔ کئی کئی دن ہو جاتے ہیں، نہ آپ آتے ہیں اور نہ آپ کی بہن محترمہ شکل دکھاتی ہیں۔ اچھا خیر چائے پئیں گے؟"

"اور یہ تو فرما رہے تھے کہ میں کئی دفعہ تمہارے گھر آیا، لیکن تم نہیں ملے۔"

"جھوٹ بالکل جھوٹ۔" شاہدہ نے دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے شرارت سے آنکھیں میچ کر کہا۔ "کمال کرتے ہیں آپ بھی شہاب بھائی۔ یہ اور ہمارے گھر آئیں۔ اچھا بھئی چھوڑو، یہ بتاؤ چائے لاؤں؟"

وُہ چائے بنانے چلی گئی اور میں حسبِ عادت وائیں طرف رکھے ہوئے بُک شیلف میں کتابیں دیکھنے لگا۔

"شہاب، یار میں کئی دن سے تم سے ایک بات پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اب یہ بُک شیلف میں فیضؔ کے شعری مجموعے دیکھ کر مجھے پھر وہ بات یاد آ گئی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "تم فیضؔ کے بارے میں پوچھوگے۔ ہاں، اس کے متعلق میں نے اپنی رائے بدل دی ہے"
"لیکن آخر کیوں؟ تم تو کہتے تھے کہ فیضؔ جس نظریئے کی تبلیغ کرتا ہے، وہ ہمارے معاشرے کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا؟"

"ہاں، میں کہتا تھا۔ لیکن غلط کہتا تھا۔ دراصل اس وقت تک میں زندگی کی اجتماعی جدوجہد میں نہ صرف شریک نہیں تھا۔ بلکہ اس جدوجہد کا ادراک بھی نہیں رکھتا۔ یہ ادراک مجھے نجمہ زیدی نے عطا کیا۔"

"وہ کون تھی؟" شہاب نے یہ نام میرے سامنے پہلی بار لیا تھا۔ اور میں حیران تھا کہ ایک لڑکی بھی شہاب کو متاثر کر سکتی ہے۔

وہ ..... "شہاب کی آواز جانو خوابوں کی وادی میں سے آ رہی تھی "وہ .... ایک ایسی لڑکی ہے، جو ہر شخص کو کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اسے پہچان نہ سکے اور کوئی پہچان

لے۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔"

میں نے غور سے شہاب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کہیں دُور خلاؤں میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"وہ مجھے ان دنوں ملی جب میں طلبا میں اس تحریک کے لئے کام کر رہا تھا، جس کا مقصد جبر و استبداد کے خلاف بغاوت تھا۔ جو وطن کے شب و روز کو ثمر بار اور حسین بنانا چاہتی تھی اور جس کی پاداش میں مجھے جیل جانا پڑا۔ وہ ایک مقامی گرلز ہائی اسکول میں ٹیچرس ہے اور ان دنوں وہ اس تحریک میں ہماری رفیق تھی۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رُکا اور پھر کہنے لگا۔

"میں اپنے اس نظریے پر اب تک قائم ہوں کہ اشتمالیت ہمارے مزاجوں سے لگا نہیں کھاتی۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ زندگی مارکسیت کا نام نہیں۔ لیکن زندگی صرف بدھ ازم، عیسائیت یا اسلام کا نام بھی نہیں۔ زندگی کفر بھی ہے اور اسلام بھی۔ زندگی نیرنگ بداماں ہے، اچھیل چھبیلی ہے متحرک ہے منجمد بھی ہے اور کھلاڑی بھی، گریاں بھی ہے اور خنداں بھی۔ زندگی عظیم ہے فیض کو محض اشتمالی شاعر قرار دینا ظلم ہے۔ وہ تو زندگی کا شاعر ہے۔ اسی نیرنگ بداماں اور عظیم زندگی کا شاعر۔ یہ سب کچھ مجھے نجمہ زیدی نے بتایا تھا۔"

"یہ بیچ میں فلسفے کو کہاں سے گھسیٹ لائے۔ تم نجمہ زیدی کے بارے میں بتا رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس تحریک میں وہ ہماری رفیق تھی۔ اس تحریک نے مجھے ہر اُس شاعر کے نزدیک کر دیا تھا جس کی تخلیقات نامساعد حالات میں حوصلہ دیتی ہیں، مجاہدوں اور تصادم کے طوفانوں سے گذر نا سکھاتی ہیں اور آزادی کی پیکار سے قوت و حرارت حاصل کر کے، حق و صداقت کا نور پھیلانے کی تلقین کرتی ہیں۔ چنانچہ لازمی طور پر، میں فیضؔ کے بھی قریب آ گیا۔ اور جس رات میں گرفتار ہوا ہوں، اس رات میں نجمہ زیدی کے گھر بیٹھا تھا۔ سارے دن کے بے پناہ کام نے ہمیں تھکا دیا تھا۔ وہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اور میں نے تھکے تھکے لہجے میں فیضؔ کی وہ نظم "نثار میں تیری گلیوں پہ ...... گنگنانی شروع کر دی تھی۔"

"کیا گنگنا رہے ہو؟" نجمہ نے پوچھا تھا۔

میں نے یہ نظم اسے سنانے کے لئے اپنی گنگناہٹ کا آہنگ ذرا اونچا کر دیا۔

"اوہ، فیضؔ...." اس نے گہرا سانس لے کر کہا تھا۔ "وہ واقعی عظیم شاعر ہے۔"

اسے میں ایک تحریکی شاعر تو ماننے لگا ہوں۔ لیکن فنی اعتبار سے بھی

وہ عظیم ہے۔ اس میں مجھے شک ہے۔" میں نے کہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرے جواب میں وہ سُنی سنائی باتیں دُہرا دے گی۔ لیکن اس نے کہا تھا:

اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ تم نے فیض کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ اور تم بھی، عام لوگوں کی طرح اسے ایک اشتمالی شاعر سمجھتے ہو۔ حالانکہ وہ اشتمالی شاعر نہیں ہے۔ وہ تو رنگ برنگ زندگی کا شاعر ہے۔ تم نے اس کی وہ نظم پڑھی ہے، جس کا عنوان "دو آوازیں" ہے؟ ۔ اگر نہیں پڑھی ہے تو پڑھو اس نظم میں اُمید اور نا امیدی، عزم اور مایوسی، عمل اور بے عملی کی کشمکش کا شاعرانہ اظہار بہت ہی دلکش ہے۔ سنو میں تمہیں سُناتی ہوں۔

پہلی آواز کہتی ہے:

جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا اور جیب و گریباں دار و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گل، اس دردِ جگر کا کیا ہو گا

دوسری آواز یوں حوصلہ دیتی ہے:

اس طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورشِ بربطِ نَے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کَے

اس کے علاوہ فیض کی نظمیں "تنہائی"۔ "کتے"۔ "شاہراہ"۔ "ہم لوگ" اور "اے دلِ بے تاب ٹھہر"۔ وہ نظمیں ہیں جو علامتی ہیں اور علامت و رمز کے موزوں

استعمال کی وجہ سے نہایت ہی وسیع الاثر ہو گئی ہیں۔"

اور ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہی تھی کہ دروازے پر پولیس نے دستک دی اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ نجمہ زیدی کو انھوں نے نہ جانے کیوں، معاف کر دیا۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ بھی گرفتار ہو گئی تھی۔ جب مجھے جب پولیس اپنے ساتھ لے جانے لگی تو نجمہ نے مجھے فیض کے شعری مجموعے دیئے اور کہا۔

"یہ عظیم کتابیں تمھیں جیل میں میری یاد دلاتی رہیں گی۔"

اور یوں فیض کا درد دبے پاؤں میرے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا۔ اور آج جب مجھے ان الفاظ کا خیال آتا ہے جو میں نے بہت مدت ہوئی تم سے کہے تھے ..... فیض ایک ہنگامی شاعر ہے ... تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ زندگی کا درد کبھی ہنگامی نہیں ہوتا۔"

یہ کہہ کر شہاب خاموش ہو گیا۔

"نجمہ زیدی آج کل کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اسی سکول میں ہے، جہاں پہلے تھی۔"

"تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ اکیلے میں تمہارا اور شاہدہ کا جی گھبراتا ہوگا۔" میں نے شرارتی لہجے میں کہا۔

شہاب نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں

چمک سی پیدا ہو گئی۔

"شاہدہ تمہارے ساتھ تنہا نہیں رہے گی، اور میں ..... میں واقعی نجمہ سے شادی کر لوں گا۔ تاکہ فیض ہمیشہ میرے قریب رہے، مجھے حوصلہ اور امنگ بخشتا رہے۔ اس کے درد کو میں تمام زندگی اپنے سینے کے ساتھ لگائے رکھنا چاہتا ہوں۔"

میری پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ شاہدہ چائے لے آئی اور پیالی میں چمچ گھماتے ہوئے میں نے دیکھا کہ بک شیلف میں رکھے ہوئے فیض کے شعری مجموعوں کو نصف النہار کے سورج کی ست رنگی شعاعیں، روشندان میں سے آ کر چوم رہی تھیں۔

باہر فضاؤں میں، بہار کی خوشبو ہولے ہولے پھیل رہی تھی ؛

# پُتلی

ایک انجانے سے احساس کے تحت میں اس کہانی کو حقیقت سمجھنے پر مجبور ہوں، لیکن اس حقیقت پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، معلوم نہیں کیوں۔

یہ کہانی مجھے شیر علی نقشبندی نے سنائی۔ وہ بہاولپور کے ایک سستے سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا، اور اچھے ہوٹلوں میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً مجھے بھی اسی ہوٹل میں قیام کرنا پڑا تھا۔ میرے اور شیر علی نقشبندی کے کمروں کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ مجھے بہاول پور کے ایڈیشنل کمشنر کی عدالت میں کام تھا اور دن میں کئی بار اس عدالت کے چکر لگانے پڑتے تھے۔ شیر علی نقشبندی کے کمرے کا دروازہ میرے چوپٹ

کھلا رہتا تھا۔ اس لانبے، لانبے بالوں اور چھدری داڑھی والے شخص کو میں نے اکثر ایک لکڑی کی پتلی سے محوِ کلام دیکھا تھا اور پاگل سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن ایک دن میں اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا اور شیر علی نقشبندی کے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے یوں بے حجابانہ اندر آتے دیکھ کر ایک لحظے کے لئے اس کے اوسان خطا ہو گئے، لیکن پھر اس نے اپنے کو سنبھال لیا اور بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ اسی دن مجھے اس کا نام معلوم ہوا اور اسی دن مجھے پتہ چلا کہ وہ لکڑی کی پتلیاں بناتا ہے۔ نگر نگر گھوم کر لوگوں کو پتلیوں کے تماشے دکھاتا ہے اور یوں اپنے پیٹ کا جہنم بھرتا ہے۔ ہارون آباد کا ذکر آیا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ وہاں بھی گورنمنٹ ہائی اسکول کے لڑکوں کو پتلیوں کا تماشہ دکھا چکا ہے۔ اس پہلی ملاقات ہی میں وہ خاصا کھل گیا۔ اس کے بعد وہ اکثر میرے کمرے میں آجاتا اور میں اس کے کمرے میں چلا جاتا۔ انھی دنوں میں اس نے مجھے یہ کہانی سنائی۔ اس نے کیا سنائی، میں نے اس سے سنی۔ شاید یہ سب کچھ جھوٹ ہو۔ ممکن ہے وہ کوئی دیوانہ ہو، خبطی ہو۔ اس وسیع و عریض دنیا میں اتنے دیوانے اور خبطی ہیں کہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس کی کونسی بات سچی ہے اور کونسی جھوٹی۔

شیر علی نقشبندی کی آنکھوں میں ایک خوفناک ویرانی تھی، جیسے شہر اُجڑ

گئے ہوں اور اُن کے بھیانک کھنڈروں میں بدروحوں نے سکونت اختیار کر لی ہو۔ وہ چھوٹے سے قد کا ایک پُر اسرار انسان تھا۔ اس کو اگر چند لمحے غور سے دیکھا جائے تو یوں لگتا تھا، گویا دور افتادہ صحراؤں کا کوئی قزاق، کسی مخفی مقصد کی تکمیل کے لئے، بھیس بدل کر شہر میں آنکلا ہے۔ اس کی عادات اعصاب کو چٹخا ڈالنے والی تھیں۔ اپنی قوتِ ارادی پر مجھے بڑا ناز ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں صدمات کے کئی پہاڑ مجھ سے ٹکرائے ہیں اور کئی عظیم معرکوں نے مجھ سے پنجہ آزمائی کی ہے۔ لیکن میرے اعصاب نے کبھی کمزوری یا خستگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ شیر علی نقشبندی کے ساتھ چند منٹ گزارنے کے بعد ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے میرے اعصاب کے ٹانکے ادھڑ رہے ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ گفتگو کے دوران میں وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیتا تھا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سرگوشی کے انداز میں "شش، شی شی" کی آواز نکالتا تھا، کوے کی طرح گردن گھما گھما کر، ادھر ادھر دیکھتا تھا اور پھر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتا تھا۔ اِک ذرا سے شور سے اُچھل پڑتا تھا اور چند ثانیوں کے بعد یوں کانپنے لگتا تھا، جیسے تیز ہوا میں گھاس کی نحیف کے نخل کانپتی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود میں نے اندازہ لگایا کہ شیر علی نقشبندی اپنے فن کا ماہر ہے اور اس سلسلے میں اس کی صلاحیتوں کا کوئی جواب نہیں یہ

اندازہ مجھے یوں ہوا کہ ایک رات اس نے میرے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنی پتلی سے اس طرح باتیں کیں کہ خود ہی سوال کرتا تھا اور خود ہی جواب دیتا تھا، لیکن محسوس یوں ہوتا تھا جیسے پتلی جواب دے رہی ہو۔ وہ جب پتلی کی طرف سے جواب دیتا تھا تو اس کے ہونٹ قطعاً حرکت نہیں کرتے تھے اور یہ شاید میری نظر کا دھوکہ تھا کہ میں نے پتلی کے ہونٹوں کو باقاعدہ جنبش کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

شیر علی نقشبندی کے کہنے کے مطابق، لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اس کی پتلیاں دراصل بُوتے ہیں، جن کو اس نے سدھار رکھا ہے۔ اس شبے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام لوگوں کو اپنی پتلیوں کو چھوکر دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اس کی پتلی کو چھوکر دیکھا تھا۔ وہ لکڑی کے ایک بے جان مجسمے کے سوا کچھ بھی نہ تھی۔ شیر علی نقشبندی کی اس پتلی کا نام بقول خود اس کے "روحی" تھا۔ روح سے اس پتلی کا کیا تعلق تھا، یہ شیر علی نقشبندی نے مجھے نہیں بتایا۔

میں نے دیکھا ہے کہ پتلیاں بنانے والوں کی پتلیاں عموماً بدہیئت ہوتی ہیں۔ لیکن روحی سے زیادہ بے ہنگم اور بدہیئت پتلی میں نے نہیں دیکھی۔ اس پتلی کی تراش خراش میں کسی نفاست کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ایک پُراسرار سی، تنفر آمیز، ہنرمندی کا احساس

جھلکتا تھا اور اس کے موٹے موٹے سُرخ چوبی ہونٹوں پہ ایک غیر معمولی درندہ سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، جیسے کوئی بے جان لاش، سفلی جادو کے زیرِ اثر مسکرانے کی کوشش کر رہی ہو۔

شیر علی نقشبندی کی کوشش ہوتی تھی کہ جہاں بھی جائے، روحی کو اپنے ساتھ لے کر جائے۔ ایک لمحے کے لئے بھی رُوحی کو اپنے سے جدا کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ حتیٰ کہ وہ رات کو بھی روحی کو اپنے ساتھ سُلاتا تھا۔

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ بہاول پور کا غصیلا سُورج صبح سے لے کر شام تک آگ برساتا رہتا اور راتیں بہت ال گزرتیں۔ ایسی ہی ایک نڈھال سی رات کا ذکر ہے کہ میں نے شیر علی نقشبندی کے کمرے سے آتی ہوئی عجیب و غریب آوازیں سُنیں۔

"چلو، پھر کوشش کرو..... میں نہیں کر سکتا..... کیوں نہیں کر سکتے ..... مجھے نیند آ رہی ہے..... ابھی سے، چلو پھر کوشش کرو"..... میں تھک گیا ہوں، اب مجھ سے کچھ نہیں ہوتا..... میں تمہارا کوئی بہانہ سُننے کے لئے تیار نہیں....." اور پھر کچھ ایسی گنگناہٹ سُنائی دی جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ یہ گنگناہٹ خاصی دیر تک جاری رہی آخر شیر علی نقشبندی کی اُکتائی ہوئی اور جھنجلاتی ہوئی آواز آئی "او شیطان کے بچے، او ابلیس کی اولاد، مجھے اکیلا چھوڑ دو..... خدا کے لئے اکیلا

چھوڑ دو۔"

اس کے بعد یہ سلسلہ کئی راتوں تک چلتا رہا۔ لیکن ایک رات تو حد ہو گئی۔ یہ عجیب و غریب گفتگو، یہ مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ مسلسل تین گھنٹے تک جاری رہی۔ تنگ آ کر میں اٹھا اور شیر علی نقشبندی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے ٹھوکر لگائی تو دروازہ کھل گیا۔ وہ شاید اندر سے چٹخنی لگانا بھول گیا تھا۔ کمرے میں برقی بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور چھت کا پنکھا ہولے ہولے گھوم رہا تھا۔ شیر علی نقشبندی اپنی چارپائی پر دو زانو ہو کر بیٹھا تھا، اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور روحی کو اس نے اپنے گھٹنوں پر بٹھا رکھا تھا۔

"فرمائیے؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں لیکن روحی کی بڑی بڑی چوبی آنکھیں، سیاہ شیشہ میرے چہرے پر پیوست تھیں۔

"معاف کرنا نقشبندی، میں مخل ہوا۔ لیکن تمہاری یہ عجیب و غریب گفتگو اور مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ جو مسلسل تین گھنٹوں سے جاری ہے مجھے سونے نہیں دیتی۔"

مجھے کوئی جواب دینے کی بجائے، شیر علی نقشبندی پتلی سے مخاطب ہوا:

"یہ ہارون آباد کے ایک شریف آدمی ہیں۔ ان کی نیند خراب ہوتی ہے۔ ...... اب ختم کریں ..... کیوں ٹھیک ہے نا؟"۔

رُوحی کے سرخ، چوبی ہونٹ جنبش میں آئے اور ان سے ایسی آواز نکلی، جیسے گیلی لکڑی دھوپ میں چرچراتی ہے۔ چند ثانیوں کے بعد یہ آواز واضح الفاظ میں بدل گئی۔

"ہاں، مجھے چارپائی پر لٹادو۔"

شیر علی نقشبندی نے پتلی کو پلنگ پر لٹا دیا۔ غالباً اس کے سر میں لگا ہوا ایک بٹن دبایا، کٹک کی آواز ہلکی سی ایک بار اُبھری اور روحی کی بے جان آنکھوں پر چوبی پلکوں کے پردے گر گئے۔ شیر علی نقشبندی نے ایک گہرا سانس لیا اور ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔

"نقشبندی، بستر کے لئے کسی گوشت پوست کے ساتھی کا انتخاب کرو۔ یہ کیا ایک لکڑی کی پُتلی کو ساتھ سُلا لیتے ہو" میں نے مذاق کے لہجے میں نقشبندی سے کہا۔

"ہاں ..... آ ....." وہ بوکھلا گیا "لیکن .. خدا کے لئے ...."

اور فقرہ پورا کئے بغیر اس نے سہمے ہوئے ہرن کی طرح روحی کی طرف دیکھا، پھر میری طرف دیکھ کر بھنویں سکیڑیں اور معنا اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "شی شی .... شش" کی آوازیں نکالنے لگا۔ مجھے اپنے اعصاب

چیختے ہوئے اور سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ میں لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا اور بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھال کر باہر نکل آیا۔

اس کے بعد مجھے تین دن تک شیر علی نقشبندی کے کمرے میں جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔

ایک شام غضب کی گرمی تھی۔ صحرائے مروٹ کی طرف سے آنیوالی ہواؤں نے بہاول پور کے گلی، کوچوں میں جانو پگھلا ہوا تانبا بکھیر دیا تھا میں بیکانیری دروازے کے اندر ظہور نظر کے چھوٹے سے، خوبصورت ریستوران میں بیٹھا ہوا تھا اور یخ لائم جوس کے جرعوں سے خشک حلق کو تر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریستوران میں ہلکی، ہلکی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک اس تاریکی کے جگر میں روشنی کا ایک پتلا سا تیر پیوست ہو گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ریستوران کا دروازہ آدھا کھلا تھا اور شیر علی نقشبندی اندر جھانک رہا تھا۔ اور شاید ریستوران کی سج دھج سے مرعوب ہو کر داخل ہونے سے جھجک رہا تھا۔ گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر میں نے اس کو آواز دی۔ اُسے جیسے میری آواز کا ہی انتظار تھا۔ جلدی سے میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے لئے بھی لائم جوس منگوایا۔ چند لمحوں کے بعد جب اس کے حواس ٹھکانے آئے تو اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا:

"آپ شاید مجھے پاگل سمجھتے ہیں؟"

"یہ اطلاع تمہیں کس نے دی؟"۔ میں نے ذرا بے تکلفی سے کہا "میں تمہیں ہرگز پاگل نہیں سمجھتا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ تمہیں اپنی پُتلی سے محبت ہے اور اس کا قرب تمہارے حواس پر اثر کرتا ہے۔ دراصل معشوق کے سامنے ہر عاشق کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔"

یکایک شیر علی نقشبندی پر وہی بوکھلاہٹ طاری ہو گئی اور وہ کندھے اُچکا کر، بڑے پُراسرار انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا، گویا کچھ سُننے کی کوشش کر رہا ہو اور پھر چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

"آپ کا خیال غلط ہے..... میں اس سے نفرت کرتا ہوں.... نفرت"

"لیکن تم تو اسے بیوی کی طرح اپنے ساتھ سُلاتے ہو۔ اگر نفرت ہے تو جلا کیوں نہیں ڈالتے سالی کو؟"

"خدا کے لئے.... " اس نے چلا کر کہا اور میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں جھنجلا گیا، لیکن خاموش رہا۔

باہر شام گہری ہو گئی تھی۔ ہم دونوں خاصی دیر تک چپ چاپ بیٹھے لائم جوس پیتے رہے۔

"یہ پُتلی تم نے خود بنائی تھی؟" مسلسل خاموشی سے اُکتا کر میں نے پوچھا۔

شیر علی نقشبندی میرے اس سوال سے چونک سا گیا۔ حالانکہ میں نے

یہ سوال یونہی بغیر سوچے سمجھے کر دیا تھا۔

"یہ پُتلی..... میں نے..." اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے.... میں نے یہ پُتلی نہیں بنائی۔"

"تو کیا کسی ترکھان سے بنوائی تھی؟"

"ترکھان.... نہیں.... ترکھان نے نہیں.... یہ پُتلی میرے باپ نے بنائی تھی۔"

"تمہارا باپ بھی یہی کام کرتا تھا؟"

"ہاں، وہ پُتلیوں کا بہت بڑا ماہر تھا اور جو کچھ میں جانتا ہوں، یہ بھی اسی نے مجھے سکھایا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی میں.... میرا مطلب ہے.... اپنے باپ کے بغیر کچھ بھی نہیں..... وہ تو پُتلیوں کا خدا تھا.... میں اپنے چہرے کے تاثرات اور حلق کے غدود کو کنٹرول نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ مجھ سے مایوس ہو گیا تھا اور کہتا تھا کہ تم یہ فن کبھی نہ سیکھ سکو گے۔" شیر علی نقشبندی نے لائم جوس کا آخری گھونٹ لیا اور پھر کہنے لگا۔ "میرے باپ کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ روٹی کھاتے ہوئے بھی روحی کی آواز میں باتیں کر سکتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تو خاموشی سے کھانا کھا رہا ہے اور روحی باتیں کر رہی ہے...... وہ سارا دن اور تمام رات مجھے مشق کرواتا تھا۔ تاکہ میں تمام حروف.....

ا، ب، ف، م، ط، ن، و، وغیرہ..... بغیر لب ہلائے ادا کر سکوں اور جب میں یہ نہیں کر سکتا تھا تو وہ مجھے بُری طرح پیٹتا تھا۔ میرے سارے جسم پر نیل پڑ جاتے تھے...... وہ بہت ظالم اور خوفناک انسان تھا..... ہر شخص اس سے ڈرتا تھا..... یہ دیکھو۔"

شیر علی نقشبندی نے جیب سے ایک سیاہ بٹوا نکالا اور اس میں سے ایک بوسیدہ سی تصویر نکال کر میرے سامنے میز پر پھینک دی۔ بوسیدگی کے باوجود، تصویر کے خدوخال واضح اور صاف تھے۔ مضبوط جبڑوں والا شیطانی چہرہ، گھنی مونچھوں کے سائے میں حبشیوں کے سے موٹے موٹے ہونٹ، چاروں طرف پھیلی ہوئی بے ہنگم ناک، سانپ کی سی چمکتی ہوئی گول گول آنکھیں، اور گنجان بھنویں، جو باہم جُڑی ہوئی تھیں۔

"تصویر سے آپ پورا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ تو مکمل شیطان تھا..... کہا کرتا تھا کہ میں تجھے اس کام کا ماہر بنا کر چھوڑوں گا، خواہ تجھے قتل کرنا پڑے..... وہ جہاں بھی جاتا تھا، مجھے اس کے ساتھ جانا پڑتا۔ تماشوں سے فارغ ہو کر وہ مجھے دبوچ لیتا تھا اور مجھے وہی مشق کرنی پڑتی تھی۔ یعنی ہونٹ ہلائے بغیر حروف ادا کرنا..... آپ میری باتوں سے اُکتا تو نہیں گئے؟"

"نہیں، نہیں..... لیکن سُنو، کافی دیر سے یہاں بیٹھے ہیں۔ رات

ہو گئی ہے۔ چلو اپنے ہوٹل چلیں۔"

"چلئے" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم ظہور نظر کے توبصورت ریستوران سے باہر آ گئے۔ بازار، برقی روشنیوں سے جگمگا اُٹھے تھے۔ گرمی کا زور بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ہم اپنے ہوٹل چلے گئے اور میں اُسے سیدھا اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں نے پنکھا چلا کر سیگرٹ سُلگا لیا اور وہ میرے بستر پہ نیم دراز ہو گیا۔ آج اس کی آنکھیں، کھوئی کھوئی سی تھیں۔

"بہر حال یہ سلسلہ"۔ اس نے لیٹے لیٹے کہنا شروع کیا۔ "کئی سالوں تک جاری رہا۔۔۔ شش اشی ۔۔۔ شش۔ کچھ سُنا آپ نے؟"

"نہیں یار نقش بندی، تمھیں تو وہم ہو گیا ہے"

"بہر حال ایک رات پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ مر گیا۔ حالانکہ میرا خیال تھا، کہ میرا باپ کبھی نہیں مر سکتا۔ اُس رات میں اپنی زندگی میں پہلی بار گھوڑے بیچ کر سویا۔ اس وقت میری عمر بیس سال تھی ۔۔۔۔ اور پھر یوں ہوا ۔۔۔۔ کہ میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا ۔۔۔۔ اس کی شکل تو نظر نہیں آ رہی تھی، اس کی آواز مجھے کہہ رہی تھی: "چلو پھر کوشش کرو ۔۔۔۔ میں تمہارا کوئی بہانہ سننے کے لئے تیار نہیں ۔۔۔ تم یہ کام کبھی نہیں سیکھ سکتے ۔۔۔۔ لیکن میں تمہیں سکھا کر چھوڑوں گا، خواہ تمھیں قتل کرنا پڑے ۔۔۔ چلو اٹھو پھر

کوشش کرو.... اٹھو۔"

"پھر؟"

"پھر مجھے اٹھنا پڑا۔" نقشبندی کا جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔ "میں آپ کی جوانی کی قسم کھاتا ہوں کہ اُس کی آواز اب بھی ہر وقت میری نگران رہتی ہے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کی یہ آواز...." وہ رُک گیا اور نہ جانے کیوں، میں نے اس کا فقرہ پورا کر دیا۔ "روحی میں سے آ رہی ہو۔"

"ہاں" اُس نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ مجھے پاگل نہ سمجھیں تو خدا کی قسم اس کی آواز روحی میں سے آتی ہے.... میں روحی سے باتیں نہیں کرتا بلکہ رُوحی مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ رُوحی کے روپ میں وہ اب بھی مجھ سے مشق کرواتا ہے اور میں اپنے میں اتنی جرأت نہیں پاتا کہ روحی کو جلا ڈالوں.... میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا.... چھوڑ بھی نہیں سکتا۔" اس کی آواز ڈوب سی گئی اور وہ میرے بستر پر یُوں لیٹ گیا، جیسے برسوں کا تھکا، ہارا ہو۔

میں نے سوچا کہ یہ شخص یقیناً پاگل ہے۔ اسے خود سے باتیں کرنے کی عادت ہے اور....

اور عین اسی لمحے میں نے ایک آواز سُنی۔ ایک باریک، دل و جگر کو کاٹتی ہوئی، اُلجھی ہوئی سی آواز۔ یہ آواز نقشبندی کے کمرے میں سے

آ رہی تھی اور شیر علی نقشبندی کو بُلا رہی تھی۔

"شیر علی، شیر علی۔"

آواز سُنتے ہی شیر علی نقشبندی ہڑبڑا کر اٹھا اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا "سنا آپ نے .... وہ پھر آ گیا ہے .... مجھے بُلا رہا ہے .... جانا پڑے گا .... مجھے جانا پڑے گا۔" وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے اس کو موت کے منہ میں جانا پڑ رہا ہو۔ "میں پاگل نہیں ہوں۔ خدا کی قسم پاگل نہیں ہوں۔"

اور وہ پاگلوں کی طرح اپنے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔ میں نے اس کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سُنی اور پھر وُہی باریک، دل و جگر کو کاٹتی ہوئی، اُلجھی ہوئی سی آواز جو شیر علی نقشبندی سے کہہ رہی تھی۔ "چلو پھر کوشش کرو ...... شاباش ..... ا، ب، ف، م، ڈ، ل ...... "

اور پھر معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اعصاب کے ٹانکے ادھڑ رہے ہوں۔ یہ بہاولپور میں میری آخری رات تھی۔ ایڈیشنل کمشنر کی عدالت میں میرا کام ہو چکا تھا۔ ہارون آباد جانے والی ٹرین بغداد الجدید کے سٹیشن سے صبح ساڑھے پانچ بجے گزرتی تھی۔ میں نے اسی وقت اپنا اسباب باندھا۔ اُس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔

ہوٹل والے کا بل چکا کر اور اس کو حیران و ششدر چھوڑ کر میں اسٹیشن پہ آ گیا اور جب ریلوے لائن کی پرلی طرف ریت کے ٹیلوں کی اوٹ سے ارغوانی رنگ بکھیرتا سورج طلوع ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ان گنت صدیوں کے بعد اجالا دیکھا ہو۔

تھی۔ وادی میں چن ڈھوک تھی جہاں وہ اور اس کے ماں باپ رہتے تھے۔
لڑکا چلتے چلتے معاً رک گیا۔

# رات کا موسم

"اور ٹوٹے ہوئے پتے کی آواز،
ان کا پیچھا کرے گی،
اور وہ گر پڑیں گے،
جب کوئی اُن کا تعاقب نہیں کرے گا۔"

(لیوٹیکس ۲۶-۳۶)

دھماکے کے بعد ایک پُرسکون لمحہ فضا پر چھا گیا۔
ٹاہلی کے تناور درخت سے ٹکرا کر ریڈی ایٹر پاش پاش ہو گیا تھا، کھڑکیوں کے شیشے کرچی کرچی ہو کر نیچے سڑک پر پھیلے ہوئے خزاں گزیدہ پتوں پر بکھر گئے تھے اور مڈگارڈ مڑ کر ٹائروں میں گھس گئے تھے۔ یہ سب کچھ ایک ثانیے

میں ہو گیا تھا۔

اور اب جبکہ فضا میں سکوت تھا تو نہر کے ٹرٹرانے والے مینڈک اور جنگل میں بولنے والے جھینگر بھی اپنی آوازوں کو قید کئے بیٹھے تھے ۔ ۔ ۔ شاید کسی اور دھماکے کے انتظار میں ۔ ۔ ۔ لیکن اور کوئی دھماکہ نہ ہوا اور لال سوہارے کے ہیڈورکس پر نارنجی روشنیاں بے حد طمانیت کے ساتھ جھلملاتی رہیں۔

اس خاموشی میں پہلا شگاف اس وقت پڑا جب ارد گرد پھیلے ہوئے گھنے جنگل میں کوئی شب بیدار پرندہ زور زور سے چیخنے لگا۔ اور پھر شگاف پڑتے گئے۔ مینڈکوں نے ٹرانا شروع کر دیا، جھینگرا اپنے مخصوص سُر تال میں نغمے الاپنے لگے اور ایک خرگوش جو دھماکے سے خوفزدہ ہو کر نہر کے کنارے اُگی ہوئی لمبی گھاس میں چھپ گیا تھا گدے کھاتا ہوا سڑک عبور کرنے لگا۔

اس طرح جب کئی لمحے گذر گئے ۔ ۔ ۔ ۔ خاموشی اور شور کے ملے جلے لمحے ۔ ۔ ۔ ۔ تو ڈاکٹر احمد سعید الدین نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ آنکھیں کھلنے کے باوجود وہ دیکھ نہیں سکتا تو بلا کسی پریشانی اور جھنجھلاہٹ کے اُس نے دوبارہ آنکھیں میچ لیں۔

ایک اور لمحہ گذر گیا۔ ڈاکٹر کچھ نیم بے ہوشی کے سے عالم میں تھا، جیسے کوئی نہ تو سو رہا ہو اور نہ ہی بیدار ہو اور اسی سوتی جاگتی کیفیت میں بڑی مشکلوں سے بھلایا ہوا پرانا خواب یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو ۔ ۔ ۔ اُس نے

ایک بار پھر آنکھیں کھولیں لیکن اب بھی کچھ نہ دیکھ سکا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے اپنا بایاں بازو اٹھانا چاہا مگر وہ کسی گرم گرم سی چیز کے بڑے دلنواز بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے بازو آزاد کر لیا۔

اُسے معلوم تھا کہ اسٹیشن ویگن ٹاہلی کے دیو قامت درخت سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی غیر معمولی اہمیت رکھنے والی بات نہ تھی، ایسے حادثے روز ہوا کرتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دماغ اس وقت اپنی جگہ سے ہل گیا ہے اور وہ اپنی سوچ کو کسی ایک نقطے پر مرکوز نہیں کر سکتا لیکن اس سے بھی وہ قطعاً پریشان نہ ہوا۔ ایسا ہوتا ہے رہتا ہے۔

سب سے پہلے اس کے ذہن میں لاہور کے کسی گمنام سے کوچے کا نقشہ آیا.... موہوم سا.... پھر ہارون آباد کی ایک صاف ستھری سڑک، پھر اپنی بیوی کا من موہنا چہرہ، اور پھر بہاولپور کے وکٹوریہ ہسپتال کے بڑے گیٹ سے لپٹ کر جھولتی ہوئی انگور کی بیلیں..... اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور آنکھوں پر جما ہوا خون پونچھنے لگا کلائی کے قریب ساری آستین لہو میں لتھڑ گئی۔ اس نے پتلون کی جیب سے رومال نکال لیا اور چہرہ صاف کرنے لگا۔ چہرے اور ناک پر کئی چھوٹے چھوٹے زخم تھے اور ان میں گھسی ہوئی شیشے کی کرچیاں بُری طرح کھٹک رہی تھیں۔

رومال پھیرنے سے یہ کھٹک اور زیادہ تکلیف دہ ہو گئی۔ اس کا جسم کانپ اُٹھا اور وہ ہائے کہہ کے رہ گیا۔

اس دفعہ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے اردگرد پھیلا ہوا منظر دیکھ سکتا تھا۔۔۔ ونڈ شیلڈ نیم دائرے کی شکل میں ٹوٹ گیا تھا۔ اس جگہ شاید اس کا سر ٹکرایا تھا۔ اسٹیرنگ وہیل اس کی طرف جُھک آیا تھا اور اس کے سینے سے صرف ایک یا دو انچ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ایک ہیڈ لائٹ اب تک روشن تھی اور اس پر پتنگوں کے کئی چھوٹے چھوٹے بادل جمع تھے اور ان بادلوں کا عکس روشنی کی زد میں آتے ہوئے ایک بڑے سے درخت کے تنے پر کانپ رہا تھا۔ کار کے اندر بالکل اندھیرا تھا۔۔۔۔ ڈاکٹر کا ہاتھ ناک کے بانسے پر تھا جہاں زخموں کی خلش ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

——— شکر ہے کہ میں عینک نہیں لگاتا۔

یہ پہلا مکمل خیال تھا جو حادثے کے بعد اس کے ذہن میں آیا۔

——— اور میں اس خیال کو پہچانتا ہوں۔

یہ دوسرا مکمل خیال تھا۔

اُس نے اپنے جسم کو کار سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن زخموں اور خراشوں کی بڑھتی ہوئی ٹیس نے اسی طرح ساکت وصامت پڑے رہنے پہ مجبور کر دیا۔

اس کی آنکھیں کھُلی تھیں اور حواس کی طرف سے پیش ہونے والی ہر چیز کو دماغ بڑے میکانکی انداز میں جذب کر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ جسمانی حواس اور اشیاء کے ساتھ اس کا اتنا گہرا، صاف اور خوشگوار رشتہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔۔۔۔ بہار کی پہلی رات کی ٹھنڈی ہوا ٹوٹے ہوئے ونڈ شیلڈ میں سے پہلو بدلتی ہوئی اندر آئی اور اس کے خون آلود چہرے پر خوشبوئیں چھڑک گئی۔۔۔۔ مینڈکوں کی آوازیں اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کی طرح مترنم اور فطری محسوس ہو رہی تھیں۔۔۔۔ رات کا اندھیرا ریشم کی مانند ملائم اور اس کے اپنے وجود کا ایسا مادّی تھا اور ہیڈ لائٹ کی زرد روشنی کا دُھرا دُور ایک دیو قامت درخت کے چوڑے چھلکے تنے میں پیوست تھا۔

—— تاروں کے جلنے کی بُو آ رہی ہے۔

اس نے ڈیش بورڈ کے نیچے سُلگتے ہوئے تاروں کے گُچھے کی طرف آہستہ سے اپنا داہاں ہاتھ بڑھایا۔ تاروں کے چھُوتے ہی اسے یوں لگا جیسے اس کی انگلیوں کی لوروں پر انگارے سُلگ رہے ہوں۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور انگلیوں کو منہ میں لے کر چوسنے لگا۔

ڈیش بورڈ کے نیچے اُلجھی ہوئی تاریں سلگتی رہیں اور ڈاکٹر بڑا امن محسوس کرتا رہا۔ اس کی نظریں ونڈ شیلڈ کے خلا میں سے گذر کر رات کی تاریکی میں آہستہ آہستہ سانس لیتے ہوئے جنگل پر جمی تھیں اور گردن ہلانے کو وہ فی الحال ایک

بے کار ضرورت سمجھ رہا تھا۔

اور جب باہر سے نظریں ہٹا کر اُس نے کار کے اندر ادھر اُدھر دیکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر رضیہ کے جسم پر پڑی۔ اس کی نرس کیپ کہیں غائب ہو چکی تھی۔ سیاہ بالوں نے پریشان ہو کر لالہ گوں چہرے کو یوں ڈھانپ رکھا تھا جیسے گلاب کے پھول پر بھنوروں کے جھگھٹے ہوں.... وہ گرم گرم سی چیز رضیہ کا جسم ہی تھا جس کے بوجھ تلے ڈاکٹر کا بایاں بازو دبا رہا تھا۔

رضیہ کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کا سر بائیں رخسار کے بل ڈاکٹر کی دائیں ران پر اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے کوئی غمِ محبت کی ماری اپنے محبوب کی گود میں سو گئی ہو۔ معاً ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اس کی انگلیاں ہولے ہولے رضیہ کے بالوں میں رینگ رہی ہیں...... انگلیاں بالوں میں رینگتی رہیں اور اُس کی نظریں ونڈ شیلڈ کے باہر والے منظر کی طرف لوٹ آئیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بہار کی تمام کنواری خوشبو اپنے سینے میں سمیٹ لی.... جنگل کا شور اب صاف سنائی دے رہا تھا اور آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی بجائے ایک دوسرے سے الگ ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر نے آنکھیں جھپکائیں اور باہر کے منظر سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر رضیہ کے جسم کو دیکھنے لگا۔ تب اسے وکٹوریہ ہسپتال کے ان تین مریضوں کا خیال

آیا جنہیں وہ مریضوں کے ایک تبادلے کے سلسلے میں چٹھیاں لے کر جا رہا تھا۔ اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اس کی گردن کے پٹھے اس بری طرح اکڑے ہوئے تھے اور اسٹیرنگ وہیل اس کی چھاتی کے اتنا قریب آگیا تھا کہ اس کے لئے گردن یا پورے جسم کو موڑنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے ریئر ویو مرر کی طرف دیکھا مگر وہ بھی اپنی جگہ سے غائب تھا۔

وہ بڑی کاہلی کے ساتھ سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

اب کیا کرنا چاہیئے؟

یہ سوال اس کے دل و دماغ پر ایک صلیب بن کر لٹکا ہوا تھا اور ذہن ایک ایسا آئینہ خانہ بن کر رہ گیا تھا جس میں ان مانوس چہروں اور جانی پہچانی جگہوں کا عکس کانپ رہا تھا جن کا اس حادثے سے کوئی تعلق نہ تھا۔

پھر ایکا ایکی یوں ہوا کہ آئینہ خانے میں عنف تاریکی چھا گئی اور کسی نامعلوم گوشے میں ایک خیال جگنو کی طرح ٹمٹمانے لگا۔

.... میں کار سے باہر نکلوں گا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر ان مریضوں کو دیکھوں گا۔ اس نے ایک بار پھر ڈیش بورڈ کے نیچے الجھے ہوئے تاروں کی طرف ہاتھ بڑھایا.... تار اب تک سلگ رہے تھے.... وہ مکمل تاریکی میں تھا.... صرف جنگل کے درختوں کے اوپر چمکتے ہوئے چاند کی نحیف کرنیں پچھلے ونڈ شیلڈ کے بلوریں فرش پر بڑے اجنبی

انداز میں ناچ رہی تھیں۔ ہیڈ لائٹ پر پتنگوں کے بادل اسی طرح جمع تھے، اور اس کی نظریں اسی طرح ونڈ شیلڈ سے باہر جنگل کے افسوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔
کچھ دیر کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ہل جل سکتا ہے۔
...... گویا اب میں پورے ہوش و حواس میں ہوں اور ذہن میں بیہوشی کی جو گرد سی جمی تھی وہ صاف ہو گئی ہے۔
لیکن اس کے باوجود دوسرے خیالات، جن کا اس حادثے سے کوئی تعلق نہ تھا قطار اندر قطار ذہن میں سے گذر رہے تھے جیسے شفاف بلور کے طاس پر پانی کی دھارا بہتی چلی جا رہی ہو ... بہاولپور کے ڈرنگ اسٹیڈیم کا مصنوعی تالاب ..... کسی کھیت کی منڈیر پہ پیلاں ڈال کر چلتی ہوئی متوالی مٹیار ..... رنگ کے تاروں پر تھرکنے والا کوئی سادہ و پُرسوز دیہاتی گیت ..... کپاس کے سفید سفید گالوں سے لدا ہوا کسی قریبی منڈی کی طرف رواں دواں گڈا۔
..... اسٹیشن ویگن پاش پاش ہو گئی ہے۔
اسے یہ معلوم تو پہلے سے تھا لیکن اب تک اس نے اپنے آپ کو یہ اطلاع نہیں دی تھی ..... بہار کی خوشبو پورے جنگل میں پھیلی ہوئی تھی اور نہر کے دوسرے کنارے پر کوئی تنہا پرندہ ہولے ہولے بول رہا تھا، جانو کسی کو سرگوشیوں میں بلا رہا ہو۔

.... مجھے دروازہ کھول کر رضیہ کو اور پچھلی سیٹ والے مریضوں کو دیکھنا چاہیئے۔

ڈاکٹر نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھایا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ جُھکے ہوئے اسٹیرنگ وہیل کے نیچے سے رینگ کر نکلا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں اور پیشانی کے زخم سے خون پھر بہنا شروع ہو گیا تھا۔ اگر خون دوبارہ نہ بہتا تو اسے پتہ ہی نہ چلتا کہ ماتھا بھی زخمی ہے کانپتی ٹانگوں اور بہتے خون کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا عقب کا چکر کاٹ کر، کار کی دوسری طرف آ گیا اور دروازہ کھول کر رضیہ کے جسم کو دیکھنے لگا جو اسی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ زخم تو رہا ایک طرف جسم کے کسی حصے پہ خراش تک نہ آئی تھی اور اس کے نرسوں والے سفید لباس پر کوئی داغ دھبہ نہ تھا۔ ڈاکٹر نے آگے کو جھک کر اُس کے پریشان بالوں کو چہرے سے ہٹا دیا.... وہ مر چکی تھی.... وہ کچھ دیر تک اس کے مردہ چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر پیچھے ہٹ گیا.... اس کی موت شاید کسی اندرونی چوٹ سے واقع ہوئی تھی...... بڑی ظالم ہوتی ہیں یہ اندر کی چوٹیں۔

اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ والے مریضوں کو دیکھا.... وہ تین عورتیں تھیں.... وہ انھیں گننے لگا.... ایک، دو، تین.... اختری کا سر

پیچھے کی طرف ڈھلک گیا تھا، گردن ٹوٹ گئی تھی اور سانس کی ڈوری کے دونوں سرے غائب ہو گئے تھے ...... زبیدہ کا جسم نموّ کے جسم پر آ پڑا تھا۔ اور ان دونوں کا سانس باقاعدگی سے چل رہا تھا .... ڈاکٹر کو یہ معلوم کر کے بے حد طمانیت محسوس ہوئی کہ دونوں محفوظ ہیں اور موت کا خوفناک ہاتھ ان سے زندگی کا تحفہ چھیننے میں ناکام رہا ہے۔

رات کی شادابیاں سرسراتی ہوئی لال سوہارے کے جنگل میں سے گزرتی رہیں اور ڈاکٹر کار کا دروازہ بند کر کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے بائیں بازو میں ٹیسیں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں .... ذہن کے کسی انجانے، بھولے ہوئے گوشے میں سے اتھاہ، گہری خاموشی کا ایک طوفان اٹھا اور وہ اس طوفان میں غوطے کھاتا ہوا اپنے کو بے حد پریشان محسوس کرنے لگا اور طوفان کے شعور کے باوجود اس کی پریشانی کم نہ ہوئی۔

..... ہم خیر پور ٹامیوالی اور لال سوہارے کے درمیان کسی جگہ ہیں اور یہ ٹلے کا علاقہ ہے۔ یہاں کے رہنے والے سادہ، محنتی، دیانتدار اور مضبوط لوگ ہیں اور ہر بات چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں ... میں کچھ نہیں کر سکتا حالانکہ مجھے کچھ کرنا چاہیئے۔ کہیں سے کوئی گڈا ہی مل جائے تو زبیدہ اور نموّ کو کسی محفوظ آرام دہ مقام تک پہنچایا جا سکتا ہے ورنہ یہ بھی زندگی سے اپنے رشتے توڑ لیں گی۔

ہیڈ لائٹ پر مچھروں اور پتنگوں کا بادل اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ روشنی دھندلا کر رہ گئی تھی۔ اس نے ہیڈ لائٹ کو بدستور روشن رہنے دیا اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھنے لگا، جو شیشہ ٹوٹنے کے باوجود اب تک صحیح کام کر رہی تھی ..... اس وقت چار بجے تھے۔

ڈاکٹر ہولے ہولے چلتا ہوا اس منڈیر پر جا کھڑا ہوا جو سڑک اور نہر کی حدِ اتصال تھی۔ وہاں سے اس نے چاروں طرف دیکھا۔ دور دور تک نظروں کی زد میں کچھ نہ تھا..... نہ کوئی گاڑی، نہ کوئی مکان اور نہ کوئی متنفّس۔ بس لال سوہارہ ہیڈورکس کی نارنجی بتیاں تھیں کہ مشرق کی طرف دو میل کے فاصلے پر یوں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ جیسے کئی باگھ دور اندھیرے میں بیٹھے آنکھیں جھپکا رہے ہوں۔ وہ بڑی آہستہ خرامی کے ساتھ ان روشنیوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

حادثے سے پہلے اس نے نارنجی روشنیوں کی اس دنیا کو نہ دیکھا تھا۔ یہ دنیا خبر نہیں کب سے موجود تھی۔ لیکن اس کے لئے اس دُنیا نے صرف پانچ ثانیے پیشتر جنم لیا تھا جب نہر کی منڈیر سے اس کی آنکھوں نے کسی مددگار چہرے، کسی محفوظ مقام کی ناکام تلاش کی تھی۔

اسٹیشن ویگن میں دو زندگیاں موت کی آغوش میں ٹھنڈی ہو گئی تھیں .... ایک نرس اور ایک مریضہ .... اور دو وجود ابھی تک زندگی کی گود

میں سانس لے رہے تھے اور اس معاملے پر غور کرنے کے لیے بڑے گھمبیر ضابطے اور سکون کی ضرورت تھی ........ اسی ضابطے کی جو سڑک کے ویران خراشوں والے سینے پر پھسلنے والی چاندکی اُداس کرنوں میں تھا. اسی ضابطے کی جس کے تحت پتوں نے اپنے چہروں پہ باریک باریک رگوں کا جال بُنا تھا اور وہ ہر پتّے کے چہرے پر مہین رگوں کی یہ نازک مُنت دیکھ سکتا تھا. اگرچہ چاندنی ملے اندھیرے میں درختوں کے تنے بھی دھندلا گئے تھے) اور اس سکون کی جو اس غیر معمولی رات کی دور تک پھیلی ہوئی پہنائی میں دل کی مثال دھڑک رہا تھا ...... اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے اپنی گردن موڑی تو وہ اسٹیشن ویگن کے اندر زندگی اور موت کا تماشہ دیکھے گا. اس کے لیے وہ سیدھا چلتا گیا اور رات کی شاداب ہوا اس کے کشادہ سینے میں بہار کا خوشبودار احساس پیدا کرتی رہی.

جوں جوں وہ نارنجی روشنیوں کے قریب آ رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی اور رگوں میں خون کا بہاؤ اس قدر جولاں ہو گیا تھا کہ اسے اپنا وجود ہوا کے شہپروں پر سوار زمان و مکان کی حدیں پھلانگتا محسوس ہوا.

اب وہ لال سوہارے کے ہیڈ ورکس پر پہنچے گا. سوال و جواب کے مرحلے سے گزرنا ہوگا اور پھر وہ لوگ کوئی سواری لے کر جائے حادثہ کی طرف بھاگیں گے ........ لیکن ابھی نہیں.

— ابھی ہیڈ ورکس تک پہنچنے میں کچھ دیر باقی ہے اور اس درمیانی

لمحے میں اپنے آپ کو میں آزادی، لاتعلقی اور امکان کے میٹھے میٹھے احساس میں گم کر سکتا ہوں۔

باغ میں گائے ہے ..... ایک بہت بڑی گائے۔ اس کی آنکھیں بہت گہری ہیں ..... سمندروں سے بھی گہری۔ وہ گھاس کھانے کی بجائے پھول کھا رہی ہے ..... گلاب، نرگس، سوسن ..... بہت ہی خوبصورت، بہت ہی پیارے پھول ......... اس کے منہ میں چبائے ہوئے پھولوں کی رنگ برنگی گھاس ہے ..... اسے کوئی منع نہیں کرتا چونکہ کوئی بھی وہاں موجود نہیں ..... وہ باغ میں بالکل اکیلی ہے اور نموّ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ زبیدہ جس کا جسم اس پہ جھک آیا تھا بدستور سو رہی تھی چاروں اور اندھیرا تھا لیکن موٹر کی ایک ہیڈ لائٹ اب تک روشن تھی۔ اختری بھی سو رہی تھی۔ نموّ نے اس کے بازو کو چھوا، اور پھر اس کو زور زور سے جھنجھوڑا۔ اس کا سر نموّ کی چھاتی پر آ پڑا اور پھر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ تب نموّ کو پتہ چلا کہ اختری مر چکی ہے۔ ڈاکٹر وہاں موجود نہیں تھا۔ نموّ آہستہ سے اٹھی تاکہ اگلی سیٹ پر سوتی ہوئی نرس کو سارے معاملے سے آگاہ کرے۔ اس نے بڑے نامعلوم انداز میں آگے کو جھک کر نرس کو جگانے کی کوشش کی مگر موت کی

نیند سے بھی کبھی کوئی بیدار ہوتا ہے وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ بے جان سے ہو کر خود بخود گود میں آن گرے اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی...... لیکن آنسو...... آنسو بھی کبھی رو کے سے رُکے ہیں؟ اور پیازی آنسوؤں کی لڑیوں نے مہندی ہوئی نازک نازک پلکوں اور شعلہ شعلہ رخساروں کے درمیان درد کا رشتہ قائم کر دیا۔
—— یا خدا نجات کے لمحے اتنے مختصر کیوں ہوتے ہیں اور اگر ایسا ہوتا ہی ہے تو پھر میں کیوں اس سیٹ پر بیٹھی ہوں..... اے خدا؟

ڈاکٹر جب ہیڈ ورکس کے قریب پہنچا تو اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اس کے بائیں کندھے میں شدید تکلیف تھی اور ٹیسیں یوں اٹھ رہی تھیں جیسے سمندر میں جوار بھاٹے اُٹھ رہے ہوں۔ اس کے دائیں جانب نہر تھی۔ اس طرح بہتی ہوئی جیسے کوئی بے سہارا بیوہ سر نیہوڑائے کسی انجانی منزل کی طرف جا رہی ہو...... ساری دنیا سے لاتعلق اور اپنے آپ سے بھی بے خبر...... جنگل کی ہوائیں رات کی تازگی تھی اور رات کی تازگی پر حادثے اور موت کے زخم تھے۔
—— اور اس وقت کیا ہو گا جب اعلیٰ حکام کو اس حادثے کی

خبر ہوگی ؟ ...... کار کے پرخچے اُڑ گئے ہیں۔ ایک نرس اور ایک مریضہ مر چکی ہیں، کار آدھی رات کے وقت درخت سے ٹکرائی ہے جبکہ تم .....
..... ڈاکٹر احمد سعید الدین ..... ڈرائیو کر رہے تھے۔ جانتے ہو اس کے نتائج کیا ہوں گے ؟

ہیڈ ورکس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ آپ ہی آپ مسکرا تا رہا اگرچہ جواب طلبی کے لئے ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز کے سامنے پیش ہونے کا خیال خاصا پریشان کن تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈائریکٹر کن الفاظ میں اس کی جواب طلبی کرے گا۔ لیکن اس سمے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ لمحوں کی جادوگری کا وقت تھا.....
..... قدموں کے نیچے بچھی ہوئی نہر کی کچی اور سخت پڑی، درختوں کی اوٹ میں چھپی ہوئی حادثہ زدہ اسٹیشن ویگن اور رات کے گھمبیر سناٹے میں جنگل کی خوشبوؤں کا کبھی آہستہ، کبھی تیز رقص ..... بس یہی موجود تھا، بس یہی حقائق تھے ..... باقی سب عدم، باقی سب جھوٹ۔

ہاں بس یہی حقائق تھے اور ان حقائق کو اس نے ان کی تمامتر ملائمت اور متغیر نا آشنائی کے ساتھ مجاز کے سارے پردے اٹھا کر دیکھا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ مشکل بات یہ تھی کہ حکام اس سے ان از حد غیر معمولی لمحات کے ادراک کی وضاحت نہیں مانگیں گے بلکہ حادثے کی تفصیلات اور وجوہات طلب کریں گے۔

_____ مگر میں کیا کر سکتا ہوں جبکہ ہوا اس قدر صاف ہے اور اشیاء کا مجھ سے براہ راست تعلق قائم ہو گیا ہے۔ یہ ٹھیک کہ رضیہ مر چکی ہے اور اختری بھی ...... میرے ماتھے پر تکلیف دہ خراشیں ہیں اور میرا بازو زخمی ہے... ہوا میں ہلکی ہلکی خوشگوار گرمی ہے اور درختوں میں ایک ان دیکھی زندگی متواتر سرسرا رہی ہے اور یہ سب کچھ ناقابلِ بیان حد تک حقیقی ہے، مناسب ہے، لامحدود ہے۔ مدہوش کُن ہے اور جذبات کی مٹھاس سے بغیر شیریں ہے۔ ایسے میں اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں اس بے پناہ لمحے کی سچائی کو تسلیم کر لوں۔ اس وقت جواب طلبی کے خوف سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ کائنات اپنی تشریح آپ کر رہی ہے۔

ڈاکٹر آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب ہیڈ ورکس پر پہنچ گیا تو اس نے دیکھا کہ نارنجی روشنیوں کے اس جھرمٹ میں اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں عین نہر کے کنارے پر وہ مختصر سا مکان یوں استادہ ہے جیسے کالے سمندر میں میں ایک موہوم سا جزیرہ ..... ہیڈ ورکس کے پل کے نیچے پانی بے محابا شور مچا رہا تھا۔ وہ اس شور کو نظر انداز کرتا ہوا مکان کی طرف چلا گیا۔ یہ شاید ہیڈ ورکس کے چوکیدار کا گھر تھا۔ اکلوتے دروازے کی جھریوں میں سے لالٹین کی ہلکی زرد روشنی غبارہ بن کر باہر نکل رہی تھی۔ ڈاکٹر دھیمے دھیمے قدم رکھتا ہوا دروازے کے نزدیک آ گیا۔ اندر ایک عورت اور ایک مرد مدھم

آوازوں میں باہم جھگڑ رہے تھے۔

—— توڈی ماں ماتاں ایس گھر دچ آئی ٔ . . . ہینکو چھڈ کہ کیا آکھدی دَتی . . . . پر . . . . . . (تیری ماں یہاں، اس گھر میں آئی . . . . . اس سے بحث نہیں کہ وہ کیا کہتی رہی . . . . . مگر . . . . . )

—— تُدراں کیس دتا . . . . . تے میںڈی امبڑی کیوں تیکو نہ دے گئی؟

(تجھے کس نے دیا . . . . اور میری ماں کیوں نہ دے گئی؟)

ڈاکٹر کئی ثانیوں تک کھڑا اُن کی باتیں سنتا رہا۔ معاً اسے خیال آیا کہ یہ سگلے کا علاقہ ہے اور یہاں ایک دفعہ بات شروع ہو جائے تو نت نئی تفصیلات کے ساتھ جاری ہی رہتی ہے۔ چنانچہ اس نے ہاتھ اٹھا کر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ آوازیں یک دم بند ہو گئیں۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ دستک دی مگر اب کی دفعہ بھی اندر کوئی حرکت نہ ہوئی۔ اس نے تنگ آ کر دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اندر سے ایک مرد کی غصیلی آواز آئی۔

"دروازے کو کیوں توڑ رہا ہے"؟

وہ بدستور دروازے کو پیٹتا رہا۔

"او ٹھہرے گا بھی کہ نہیں، کون ہے تو نواب کی اولاد"؟

ڈاکٹر نے منہ کھولا لبوں کو تھوک سے تر کیا اور چلّا کر کہا

—— مجھے مدد کی ضرورت ہے

حادثے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ڈاکٹر کے حلق سے آواز نکلی تھی اور اس آواز میں وہ سب کچھ تھا جو ایک صحت مند انسان کی آواز میں ہونا چاہیئے۔

——— میں تو اپنے کو بیمار سمجھ بیٹھا تھا مگر میں تو بھلا چنگا ہوں۔

اور پھر یکایک اُسے اپنا سر گھومتا ہُوا محسوس ہُوا۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں اور یوں لگا جیسے وہ گہرے پانیوں میں تہ در تہ ڈوبتا ہی چلا جا رہا ہے۔ جب دورانِ سر ذرا کم ہوا اور آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ دروازہ ایک جھری کی صورت میں کھلا ہوا ہے اور لالٹین کی زرد روشنی اس کے چاروں طرف کچا سونا بکھیر رہی ہے اور ایک ادھیڑ عمر کا تنومند شخص پنیل منڈھی لاٹھی لیے اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے تیوریاں چڑھا کر ڈاکٹر کے زخمی بازو کو اور خون آلود پیشانی کو دیکھا۔ ایک قدم پیچھے ہٹا اور لاٹھی پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

——— مدد لے کر پہنچو کار کی ٹکر ہو گئی ہے۔

بیہوشی کے غلبے میں ڈاکٹر کو پتہ ہی نہ چلا کہ اس کی آواز کمزور ہو کر سرگوشی بن گئی تھی۔

لمحوں کے کئی کارواں گزر گئے تھے اور کچھ نہیں ہوا تھا۔۔۔۔ نمو نے نازکی کے ایک بہت ہی لطیف احساس کے ساتھ ہولے ہولے اپنی آنکھیں

کھولیں اور گردن کو ذرا خم دے کر زبیدہ کو دیکھا ..... زبیدہ ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی اور پسینے کی لڑیوں کے پیچھے اس کا چہرہ خزاں کے موسم میں کھلنے والے گلاب کا ایسا زرد ہو رہا تھا۔

نمو نے کار کے اندر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں اختری اور نرس کے مردہ جسموں اور ٹوٹی ہوئی چیزوں کے علاوہ کچھ بھی تو نہ تھا اور باہر جنگل میں سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا جھوم رہی تھی۔

نمو دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ کچھ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر یوں دروازہ بند کرنے لگی کہ ذرا سا بھی شور ہوا تو سب جاگ اٹھیں گے۔

—— مگر سوال یہ ہے کہ میں باہر کیوں آئی ہوں ؟

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کار کے قریب آ گئی اور اگلے پہیے کے مڑے ہوئے مڈگارڈ کو سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

—— پاگل ہوں میں بھی، بھلا یہ سیدھا ہونے لگا ہے ... میرا جسم کمزور ہے۔

جنگل کی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے اور دل کے رمنوں میں رات کے پچھلے پہر کی ٹھنڈکیں خنک چھڑکاؤ کر گئیں۔

—— اس سے پہلے کہ میری اور زبیدہ کی خاطر وہ واپس آئے مجھے یہاں سے

چلے جانا چاہیئے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ضرور واپس آئے گا۔۔۔۔ وہ ہمیشہ واپس آتا ہے۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ ڈاکٹر کو اور نرس کو اور اس دوسری لڑکی کو تو اپنے ساتھ لے جائے اور مجھے چھوڑ جائے۔

وہ بڑے نامعلوم انداز میں مڑی اور جلدی سے نہر کی پٹری پار کر کے جنگل میں داخل ہو گئی۔ جنگل بہت گھنا تھا۔ درختوں کی شاخیں نیچے تک جھک آئی تھیں۔ سطح زمین کو خود رو جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور وہ درختوں اور شاخوں سے یوں دامن بچا کر گذر رہی تھی جیسے کنواری مریم گناہوں سے پہلو بچاتی ہوئی چل رہی ہو۔

ڈاکٹر نے اپنی ٹوٹے ہوئے شیشے والی گھڑی میں وقت دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ اسٹیشن ویگن کو چھوڑے ہوئے آدھ گھنٹہ گذر چکا ہے۔ وہ ادھیڑ عمر شخص اور اس کی بیوی مدد حاصل کرنے کے لئے کسی قریبی گاؤں میں جا چکے تھے۔ اس کی پیشانی کی مرہم پٹی ہو چکی تھی اور زخمی بازو کسی پھٹے پرانے دوپٹے سے بنی ہوئی گل پٹی میں بڑے آرام سے جھول رہا تھا۔ بان کی کھرّی چارپائی پر جب اس نے اپنے جسم کو بے حد پُرسکون محسوس کیا تو اس نے پوری طرح آنکھیں کھول کر دیکھا۔۔۔۔ ان کا سترہ برس کا لڑکا اس کے سرہانے بیٹھا اونگھ

رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کی بھوک تھی۔ ڈاکٹر نے لڑکے سے کوئی بات نہ کی اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ چھریرے بدن، لانبے قد اور چوڑے کندھوں والا وہ لڑکا لالٹین کی زرد روشنی میں اُسے بہت اچھا لگا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر بالوں کا ایک گچھا جھول رہا تھا اور گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں لالٹین کی زرد روشنی کو اپنے اندر جذب کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

خاموشی سے اُکتا کر ڈاکٹر نے اپنی مرہم پٹّی کی ہوئی پیشانی کو سہلانا شروع کر دیا اور لڑکا اپنی نیند بھری آنکھوں کو دونوں ہتھیلیوں سے مسلنے لگا۔

لڑکے کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ تب اس نے بے حد اُکتائے ہوئے لہجے سے ڈاکٹر سے کہا:

—— سورج ٹپّاں بیا بھریندا اے، سویر تھیں ای آلی اے۔

(سُورج ہمک رہا ہے، صبح ہوتے ہی والی ہے)

ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

—— اگر کسی کے پہنچنے سے پہلے ہی ممّو اور زبیدہ کو ہوش آ گیا تو بہت بُرا ہو گا۔ کہیں دہشت زدہ ہو کر، مدد کی تلاش میں جنگل میں نہ بھٹک جائیں۔ اور یہ کم بخت بھی اس لڑکے کو چھوڑ کر خبر نہیں کہاں جا بیٹھے ہیں۔

"او بھائی گھگڑی والے"

"—— کیا ہے؟"

"جیو، کتنے آدمی تھے تم موٹر میں؟"

"—— چار، مجھے چھوڑ کر۔"

"کتنے مرے ہیں؟"

"—— دو"

"اور دوسرے زخمی ہوئے ہیں؟"

"—— پتہ نہیں، وہ دونوں بیہوش ہیں۔"

"یہ سب ہوا کیسے؟"

"—— تمہارا مطلب ہے یہ حادثہ؟"

—— "ہاں"

ڈاکٹر نے کندھے جھٹکائے اور پوری دیانت داری سے کہا۔

—— "مجھے نہیں معلوم"

"اور موٹر تم ہی چلا رہے تھے؟"

"—— تیری زال کو پھنڈر کراں، تجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ کیسے ہوا؟"

اس غیر متوقع حملے سے ڈاکٹر گھبرا گیا۔

—— "میں شاید چلاتے چلاتے سو گیا تھا۔"

معاً لڑکے نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے زخمی مہمان کو بڑی نا دیا بات کہہ دی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں تو معذرت نہ کی۔ البتہ نرم لہجے میں ڈاکٹر

سے پوچھنے لگا۔

"تمہارے سر میں درد تو نہیں ہو رہا؟"

"——— نہیں۔"

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ خاموشی کا یہ وقفہ ابھی زیادہ طویل نہیں ہونے پایا تھا کہ لڑکا بڑے دکھ سے تڑپ کر بولا:

"مرنے والوں میں تمہارا اپنا بھی کوئی بھائی بند تھا؟"

"نہیں، ایک نرس تھی اور ایک مریض عورت۔"

لڑکا بڑے غور سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے حلقے تنگ ہو گئے تھے۔ ماتھے کی سلوٹوں میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ شہادت کی انگلی کا ناخن دانتوں سے کترتے ہوئے کہنے لگا:

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کبھی ایسی غلطی نہ کرتا۔"

اور ڈاکٹر سوچنے لگا کہ میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی، یہ تو بس اپنے آپ ہو گیا۔ تب اس نے حادثے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کے متعلق سوچنے کی کوشش کی لیکن اس کے خیالات اس سمے اُلجھے ہوئے تھے اور وہ بان کی کھری چارپائی پر لیٹا سرکنڈوں کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

——— یہ سب کچھ ایک خواب سا ہے۔ لیکن پھر بھی ایک حقیقت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دو انسان مر چکے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اتنی مکمل موت کہ اس میں شک شبہ کی کوئی

گنجائش نکالنا بھی پاگل پن ہے.... لیکن یہ کتنی بڑی ٹریجیڈی ہے کہ میں
اس موت کے بارے میں کچھ محسوس نہیں کر سکتا.... نہ خوشی.... نہ غم...
.... جنگلی لڑکے تم شاید نہیں جانتے کہ مرنا اور مرتے ہوئے دیکھنا کتنا خاموش
اور پُر سکون عمل ہے...... یہ عمل ہر شئے کو اپنی حقیقی جگہ پہ پہنچا دیتا ہے....
.... موت کے علاوہ سب کچھ بے معنی ہے، پاگل پن ہے۔ بے وقوفی کی بات ہے۔
اور اب ڈاکٹر کا جی چاہا کہ وہ اپنی نقاہت کو بھلا کر اٹھے اور نہر کی پٹڑی
پر دور تک چلتا جائے....... ہمیشہ چلتا رہے.... نہر کے کنارے
اُگی ہوئی گھاس کو سونگھے، یہ معلوم کرے کہ زندگی اور موت ہر لحظہ نت نئی شکلیں
اختیار کر رہی ہے اور دن کا اُجالا روشنی کے روپ میں چاروں طرف پھیل
جائے تو وقت اور انسان کے ہنگاموں سے دُور لال سوہارے کے جنگل میں
یوں ڈوب جائے جیسے بھاری پتھر دریا میں ڈوب جاتے ہیں۔

——— عقل و خرد کی تماشا گاہوں سے دامن بچا کر جنون و عشق کے جنگلوں
اور صحراؤں کی ایک سادہ و پُرسوز کہانی بن جانا فرار کی ایک کیفیت ہی سہی
مگر بہت پیاری، بہت دلنواز کیفیت ہے۔

وہ جو مدد لینے گئے تھے، ابھی تک واپس نہیں آئے۔ لڑکا حقے کی چلم
میں تمباکو بھرنے میں مصروف تھا اور باہر موسم بہار کی ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔

——— ڈاکٹر..... اسپیشلسٹ..... نرسیں..... مریض....

جب سب مر جاتے ہیں تو ان کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟ ..... میری بیوی کی آواز سے بھی کم، گریہ کی ان جھاڑیوں سے بھی کمتر جو بے ہنگم انداز میں بس پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں ..... اس اُجڈ مڈلر کے سینے میں پمپنگ کرتے ہوئے دل سے بھی حقیر ..... موت کے بعد سب کچھ ختم ہو جاتا ہے ..... کائنات ہر موت کے ساتھ مر جاتی ہے اور یہ اس کا انجام ہے ..... میں ہسپتال میں ہوں ...... اور اگر مجھے جیل نہ بھیجا گیا تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی ..... میری بیوی، میں فون پر اس کی آواز سن سکتا ہوں ..... لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ڈاکٹر نے ایک سگریٹ سلگا لیا اور ماچس پرے پھینک دی۔ سگریٹ کا دھواں کمرے کی بھاری ہوا میں ایک ننھا سا بادل بن کر تیرتا رہا۔

—— میں نے دو انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا ہے، مار دیا ہے۔ اگرچہ میرا ارادہ ہرگز یہ نہ تھا۔ لیکن وہ مر گئے ہیں، اور پتھروں کی طرح بے جان ہیں، برف کی مانند ٹھنڈے ہیں ..... ایک نرس اور ایک مریضہ ..... رضیہ اور اختری ..... ایک صحت مند، ایک بیمار ..... گھنے اور بھورے بال جیسے شہد کا چھتا ..... کالی سیاہ آنکھیں ..... میں اسے تین برس سے جانتا تھا ..... اور وہ کیا تھی ..... ایک نرس؟ ..... رضیہ؟ ..... یا اختری؟ ..... یا نروؤں کی اعصابی حرکت؟ ..... یا گوشت کے لوتھڑے

گالوں والی ایک ناتواں لڑکی جس کا مرض کئی سال ناقابلِ تشخیص رہا... میں رضیہ کے ساتھ سونا چاہتا تھا.... میں اس کے لب چُوسنا چاہتا تھا... لیکن اب بہت دیر ہوگئی ہے.... کئی صدیاں بیت چکی ہیں۔

اس نے آخری کش لے کر سیگرٹ کو پاؤں تلے مسل دیا اور پھیپھڑوں میں سے دھواں یوں خارج کرنے لگا جیسے دمِ نزع بیمار کا سانس اُکھڑتا ہے۔

—— آج کے بعد سے میں اپنے کو دنیا کے سامنے مسٹر احمد سعیدالدین کی حیثیت سے لاؤں گا.... سابق ڈاکٹر احمد سعیدالدین.... یہ نیا نام میں لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کردوں گا جیسے کوئی مصافحے کے لیئے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لیکن کوئی مصافحہ کرنے والے کے چہرے کو نہیں دیکھتا۔

کتنا اداس اور الجھا ہُوا تھا لال سوہارے کا جنگل.... ہر درخت، ہر جھاڑی ہر شاخ باہم بُری طرح گتھم گتھا ہو رہی تھی.... نمّو صبح کے اولیں دھندلکے میں ہولے ہولے چل رہی تھی۔ اس کا کاہی لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور ساری شلوار پر محبت بُوٹی چپک گئی تھی، کانٹوں نے اس کی ایڑیوں پر خراشیں ڈال دی تھیں اور وُہ ہاتھ بڑھا کر اپنا راستہ تلاش کر رہی تھی بھیگے پتے اور نم شاخیں اس کے چہرے پر اوس کا چھڑکاؤ کر رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد نمّو رُک گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی، دونوں ہتھیلیوں سے شہد آگیں بالوں کو درست کیا، چہرے سے اوس کے قطرے پونچھے اور پھر

جنگل کی تازہ ہوا کو اپنے سینے میں داخل کرنے لگی۔ وہ اکیلی نہیں تھی .... کبھی بھی اکیلی نہیں تھی۔ (تنہا ہونا بڑی خوفناک بات ہے .... قطعی ناقابلِ برداشت؟ .... درختوں پر شہید جوانیاں لٹک رہی تھیں .... مضطرب، دکھی، مصلوب اور زخموں سے چھلنی جوانیاں ...... ان کی آنکھوں میں میٹھے میٹھے درد کے بادل تھے، ان بادلوں میں دکھوں اور آفتوں کا پانی تھا اور یہ درخت اِن مقہوروں کی آخری پناہ گاہ تھے .... نمّو سرس کے ایک قد آور درخت کے قریب پہنچی اور اس کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی ... وہ سارے شہیدوں سے بڑھ کر نازک تھا اور خوبصورت تھا ..... اس کا سانچے میں ڈھلا ہوا، متناسب جسم کسی یونانی دیوتا کا ایسا تھا ...... اس نے نمّو کو دیکھ کر نظریں پھیر لیں اور شاید اپنے الہامی منبع کی طرف دیکھنے لگا ...... اس کو یوں اپنے سے نالاں دیکھ کر نمّو نے ایک آہ بھری اور اپنے پیاسے جذبہ رحم کو لے کر آگے بڑھ گئی۔

تب ڈاکٹر نے بے حد فکر مندی سے سوچا۔

ـــــــ بے خبری میں قتل کی کیا سزا ہے؟ .... ۳۰۴ الف .....

دو سال قید یا ایک ہزار روپیہ جرمانہ۔ لیکن اس کا فائدہ کیا ہوگا .... کیا وہ

زندگیاں واپس آجائیں گی؟ ..... نہیں ہرگز نہیں .... اختری اور رضیہ مر چکی ہیں۔ خدا کی قسم میں نے انھیں نہیں مارا۔ یہ محض ایک حادثہ تھا اور اس کے باوجود وہ مردہ ہیں ..... بالکل مردہ، جیسے میں نے انھیں ارادتاً چاقو یا بندوق سے مارا ہو.... غفلت .... ایک خواب آلود لمحہ .... بے توجہی کا ایک ذرا سا اظہار..... اور میں پرسکون ہوں ...... قطعی پُرسکون..... مجھے اس گھر کو اکھاڑ پھینکنا چاہیئے تھا، زور زور سے رونا چاہیئے تھا۔ پتھر کے بُت کی طرح گونگا ہو جانا چاہیئے تھا یا اُن کی سرد نعشوں کو بازوؤں میں لے کر دردناک بَین کرنے چاہئیں تھے۔ لیکن آخر کس لیئے..... کیوں ...... ان کا گوشت، ان کی چربی، ان کی ہڈیاں اپنا کام چھوڑ چکی ہیں.... وہ صرف بے جان گوشت کے ڈھیر ہیں.... اب کوئی مسیحا ان میں روح نہیں پھونک سکتا.... مگر ان کی موت کس قدر غیر حقیقی ہے کہ مجھے اب تک اس موت کا یقین نہیں آرہا..... شاید یہ سب کچھ ایک مذاق ہو، ایک دھوکا ہو۔

لڑکے نے حقّے کا ایک گہرا کش لیا اور منہ پُھلا کر دھواں چھوڑ دیا۔

—— "اوئے بھرا گھڑی والیا۔"

—— "کیا ہے؟"

—— "اب تم کیا کرو گے؟"

ڈاکٹر نے کندھے جھٹکا کر لڑکے کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا۔
"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا....."
—— "بکواس بند کرو۔"
ڈاکٹر پلنگ پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چل کر باہر جانے لگا۔
—— "بھئی کہاں جا رہے ہو؟"
ڈاکٹر رُک گیا اور گردن موڑ کر لڑکے کو دیکھنے لگا۔ پھر اسی طرح چلتا ہوا باہر آگیا اور گھر کے سامنے زمین پر ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

جنگل تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ درخت اتنے گھنے ہو گئے تھے کہ چاندنی بھی ان کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھی اور زمین تک نہ پہنچ پاتی تھی۔ نمّو نے احتیاط سے اپنا بازو آگے بڑھایا اور اندھیرے میں ایک جھکی ہوئی شاخ تلاش کر لی۔ اس شاخ کے ذریعے وہ درخت کے تنے تک پہنچ گئی۔ وہاں سے اسے ایک نئے درخت کی شاخ ہاتھ آگئی۔ اس کے سہارے وہ دوسرے درخت تک پہنچ گئی اور یوں وہ شاخوں کی رہبری میں درخت درخت اپنا سفر طے کرتی رہی اور اپنے تلوؤں کے تلے شبنم کا لوچ محسوس کرتی رہی۔ جنگل میں جنگلی جانوروں کا شور اور نقل و حرکت مسلسل جاری تھی اندھیرے میں درخت

یُوں دکھائی پڑ رہے تھے جیسے کسی گم گشتہ گلّے کے سیاہ فام، خمیدہ چرواہے ہوں۔ جب آگے بڑھنے کی ہمّت جواب دے گئی اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے تو وہ نہر کی طرف لوٹ آئی۔ وہاں اس نے دیکھا کہ نہر کے پانی میں چاند کے کئی ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ایک خرگوش نے اپنی گول گول آنکھوں سے اُسے گھورا اور پھُدکتا ہوا لمبی گھاس میں غائب ہو گیا۔ مینڈکوں کی ٹرّاہٹ موقوف ہو گئی وُہ کنارے پر بیٹھ کر اپنی انگلیوں سے پانی کی سطح کو چھُونے لگی اور پھر بڑی خاموشی سے اس نے اپنے جوتے اتار کر نہر میں بہا دئے۔ پانی سرل سرل بہتا رہا۔

——"اوئے بھرا گھڑی والیا"

——"کیا ہے؟"

——"تمہیں کیا ہُوا ہے؟"

——"کچھ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں"

ڈاکٹر بدستور سر پکڑے بیٹھا تھا اور لڑکا اس کے لئے بڑی پریشانی کا اظہار کر رہا تھا۔

یہ شاید مجھے مجرم سمجھتا ہے۔ . . . شاید آج سے ہر ایک مجھے مجرم سمجھے گا۔

چونکہ میں بے حد پرسکون ہوں ..... شور، غل، بکواس، بے مقصد تفتیش سزا، جرمانہ ..... لیکن میں تو جیل جانے سے بھی نہیں ڈرتا .... میں تو خود موت کے گھاٹ اُتر چکا ہوں ...... مجھے جیل بھیج کر انھیں کیا مل جائیگا ..... میں ڈرتا ہوں ان فضولیات سے جو انکوائری کے دوران رونما ہونگی ڈاکٹر کا ہاتھ خود بخود اس کی گود میں آگرا۔ اس کے چہرے کے پٹھے کھنچ گئے تھے اور وہ مسکرا رہا تھا۔

میں اس فضول انکوائری کا شکار نہیں بنوں گا۔ میں خودکشی کرلوں گا۔ لیکن لوگ کیا کہیں گے۔ یہی ناکہ میں نے شرمندگی کے مارے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہے۔

لڑکے نے نر بطخ کی مانند گردن اُچکا کر دور شمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اوئے بھرا گھڑی والیا"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ابا اور اماں گڈا لیے آرہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے چونک کر سر اٹھایا

"کتنی دور ہیں؟"

وہ دیکھو، بلوچوں کی ڈھوکوں کے قریب سے، لودنے کے سرسبز ٹیلوں کے قریب سے اور چھوری والے لوٹبے کے قریب سے بیل قلانچیں بھرتے

آرہے ہیں۔"

ڈاکٹر بے ساختہ مسکرا اُٹھا۔

آگیا کمبخت اپنے "ملے" کی بولی پر۔

ڈاکٹر وہیں بیٹھا اپنے پیر کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگا اور لڑکا بدستور شمال کی طرف دیکھتا رہا۔

نجات کا کوئی کنارا نہیں...... دوست، ملازمتیں، روزمرہ کے معمول، اچھی کتابیں..... میں ننگے پاؤں زمین پر چلنا چاہتا ہوں.... یوں کہ میری آنکھیں بند ہوں اور مجھے موت کا کوئی خوف نہ ہو اور اوس میں بھیگی ہوئی ہَوا میرے سارے گناہ دھو ڈالے۔

ایکا ایکی ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے قے کرنی شروع کر دی۔

نہ تو کچھ ہوا تھا اور نہ ہی کوئی تبدیلی عمل میں آئی تھی۔ لیکن اس سے کیا ثابت ہوا؟...... کچھ بھی تو نہیں...... اگر وہ اس کے لئے واپس نہیں آیا تو کیا ہوا۔ دوسرے بھی تو موجود ہیں...... وہ بے قابو، طوفانی جوانیوں کو تنظیم و ضبط کی تلقین کرنے والے۔ وہ جو بدترین روحانی بے پروائی

اور جسمانی عذاب کو یازد میمیٹے بڑے سکون سے دیکھتے رہے۔ عظیم انسان جنھوں نے ہر تقدس کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا، جنھوں نے مذاق اُڑایا، جنھوں نے دھتکارا اور جنھوں نے تباہ کیا۔ وہ جنھوں نے اپنے سبز متعفن بڑی کاہلی کے ساتھ جھکا لیے تاکہ اپنے بے رحم قہقہوں کی گونج اچھی طرح سُن سکیں اور جب تمام جوانیاں درختوں پر شہید ہو گئیں تو انھوں نے جنگل میں نئے شکار کی تلاش شروع کردی.... وہ ممو کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔ انھوں نے بڑے بڑے متعفن اودھ رکھے ہوں گے، ان کے بازو ننگے ہوں گے، وہ خوفناک قہقہے لگائیں گے اور اس کی شلوار کے پائنچے اوپر اٹھا کر اس کی بے بس پنڈلیوں میں اپنی لوہے کی ایسی انگلیاں چبھوئیں گے۔ ان کے قہقہوں کا شور ایسا ہی ہوگا جیسا برف پر لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا شور ہوتا۔

ممو آہستہ سے نہر میں پھسل گئی۔ پانی اس کی چھاتی تک آرہا تھا۔ اس کی قمیص میں پانی بھر گیا تھا اور وہ پھولے ہوئے غبارے کی مانند سطحِ آب پر تیر رہی تھی۔ ہوا بند تھی اور پرندے صبح کی ٹھنڈک میں خاموش تھے۔ مشرق میں سورج کی کرن یوں انگڑائیاں لے رہی تھی جیسے سہاگ رات کو سو کر کوئی شرمیلی دلہن اٹھ رہی ہو۔ ندی کی لہر لہر پر شاداب رنگوں کا متوالا رقص تھا اور ممو پانی کی یخ بستگی میں بے حد سکون محسوس کر رہی تھی۔

"ـــ اوئے بھرا گھڑی دالیا۔"

"اکھیاں تاں کھول گڈا آگیا ای"۔

اور جب ڈاکٹر نے آنکھیں کھولیں تو ایک بڑا سا گڈا جس پر کئی دیہاتی لدے ہوئے تھے، دھول اڑاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا اور گڈے والوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اسٹیشن ویگن کی طرف بھاگ گیا۔

جب وہ اسٹیشن ویگن کے قریب پہنچا تو اس نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ لیکن نگاہوں کی زد میں کوئی نہ تھا۔ وہ اسٹیشن ویگن کی طرف مڑا اور کھلے ہوئے دروازے میں سے رضیہ کے مردہ جسم کو دیکھنے لگا۔ رضیہ کی لاش پر چند کیڑے چہل قدمی کرنے میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر نے لاش کا سرد بازو تھام کر باہر نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا مردہ جسم کسی وزنی پتھر کا ایسا بھاری ہو گیا تھا

"ــــ ڈاکٹر"

ڈاکٹر کے ہاتھ سے رضیہ کا بے جان ہاتھ چھوٹ گیا اور لاش سیٹ پر اوندھے منہ گر گئی..... ڈاکٹر کے پیچھے نمو کھڑی تھی۔ اس کے پاؤں ننگے تھے۔ گیلے کپڑے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے۔ بھیگے بال کندھوں پر ہولے ہولے بل کھا رہے تھے اور نہر کی شبنمی پانی کے درخشاں قطرے صبح کی اولین روشنی

میں اس کے چمپئی رخساروں پہ یوں دمک رہے تھے۔ جیسے چاند اور سورج
نے کہکشاں کی ردائیں اوڑھ لی ہوں۔ وہ بڑی شگفتگی سے مسکرا رہی تھی۔
"تمھارے جانے کے بعد جب میری آنکھ کھلی ڈاکٹر تو میں جنگل میں نکل
گئی اور پھر نہر میں تیرتی رہی۔ میں نے اتنا اچھا پانی کبھی نہیں دیکھا ڈاکٹر۔"
یک دم اسے یاد آیا کہ بھیگے ہوئے لباس میں اس کے جسم کا ہر پیچ و خم
نمایاں ہو رہا ہے۔ اس نے نئی نویلی دلہن کی طرح شرما کر اپنا جسم چرا لیا۔
——"پانی رات کے سمے گدلا گدلا سا لگتا تھا۔ لیکن اب تو یوں لگتا ہے
جیسے سپید موتی پگھل رہے ہوں ...... مجھے یہاں کوئی جانی پہچانی شکل
نہیں ملی اور کار میں میرا دم گھٹنے لگا تھا ..... بہر حال یہ جگہ بہت پیاری ہے۔
وعدہ کرو ڈاکٹر کہ ہم ایک بار پھر یہاں ضرور آئیں گے۔ لیکن صرف تم اور میں،
اور کوئی ہمارے ساتھ نہ ہوگا۔"

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ٹوٹے ہوئے ونڈ شیلڈ میں سے ایک کرچی
اکھڑ کر کار کے بونٹ پر گر گئی۔ ڈاکٹر دو قدم آگے بڑھا اور تمو کے جسم کو اپنی
کہنی سے ضرب لگائی۔ تمو ایک لحظے کے لئے لڑکھڑائی اور پھر اپنی آنکھوں میں
حیرانی لئے چپ چاپ پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

تب ان دونوں نے پشیمانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا وہ اپنے
جسم کے اس حصے کو سہلانے لگی جہاں کہنی کی ضرب لگی تھی۔ اب اس کے چہرے

سے حیرانی کا تاثر غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک مکمل سنجیدگی نے لے لی تھی۔۔۔۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"ڈاکٹر کیا مجھے بھی مر جانا چاہیئے تھا؟"۔

ڈاکٹر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس لمحے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کبھی پاگل پن کی مریضہ تھی۔

"نہیں تمہیں نہیں مرنا چاہیئے تھا اور نہ ابھی مرنا چاہیئے"۔

ڈاکٹر کی آواز میں صبح کی تازگی تھی۔۔۔۔۔ نمو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی افشاں بکھر گئی اور وہ ڈاکٹر کے مضبوط بازوؤں میں سمٹ آئی اور پھر یوں ہوا کہ ڈاکٹر بھی اس کے رخساروں پر آنکھیں رکھ کر، حادثے کے بعد پہلی بار زار و قطار رو دیا۔

وہ یونہی ایک دوسرے کے بازوؤں میں سمٹے کھڑے رہے اور گدھے کے بیلوں کی گردنوں میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں کی آواز قریب آ گئی جیسے کئی مندر مل کے گجر ایک ساتھ بج اٹھے ہوں ؂

# اکیلی کونج کا گھونسلہ

مروٹ کے صحرا کا سرمائی سورج، ریت کے کم اونچے ٹیلوں پر ارغوانی روشنی بکھیرتا ہوا آہستہ آہستہ از حد بے دلی سے یوں غروب ہو رہا تھا جیسے دن کا سفر اتنی جلدی طے ہو جانے پر سخت مغموم ہو..... قورٹ عباس سے لے کر راجپوتانے اور بیکانیر کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے اس ریگزار میں سردیوں کا سورج ہمیشہ مغموم رہتا ہے..... سال کے ان تین مہینوں میں اس سے گرما کی ساری تابانی، ساری آگ اور سارا غصیلا پن بے طرح چھن جاتا ہے۔

نرم اور اُداس ارغوانی روشنی میں وہ چھوٹا سا، بانکا سجیلا لڑکا بڑے البیلے انداز میں، اس بل کھاتی، تنگ پگڈنڈی پر چل رہا تھا جو کبھی ان ٹیلوں کے دامن سے لپٹتی، کبھی ان کی چوٹیوں کو پھلانگتی اور کبھی ان سے پہلو بچا کر ایک طرف کو نکلتی ہوئی ایک وسیع و عریض تکونی وادی میں جا کر ختم

ہو جاتی تھی۔ وادی میں چن ڈھوک تھی جہاں وہ اور اس کے ماں باپ رہتے تھے۔

لڑکا چلتے چلتے معاً رُک گیا، جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اور پھر پگڈنڈی چھوڑ کر جلدی جلدی ریت کے ایک قدرے اونچے ٹیلے پہ چڑھنے لگا۔ اس کے پاؤں ریت میں مسلسل دھنس رہے تھے۔ جب وہ چوٹی پر پہنچا تو اس کا سانس پھول گیا تھا۔ وہاں رُک کر اس نے دیکھا کہ سنہری جھالروں والے شفاف بادلوں میں سے شام کی روشنی، کرنوں کی اَن گنت موٹی موٹی رسیوں کے سہارے، بوقلموں رنگ بکھیرتی، نیچے زمین پر اُتر رہی تھی۔ اور مانو اِن رسیوں میں جکڑا اُس کا توڈا (اونٹ کا بچہ) ذرا فاصلے پر ٹوبے کے قریب کھڑا تھا۔ ٹوبے کے چاروں طرف مٹی مٹی صحرائی جھاڑیوں کا ایک چوڑا سا سبز حاشیہ تھا اور جگالی کرتا ہوا توڈا اِس حاشیے کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن شاید اس کے چھوٹے سے، بالوں بھرے کوہان میں ابھی خوراک کا کچھ ذخیرہ موجود تھا۔ اس لئے وہ گومگو کی کیفیت میں تھا کہ ہرے بھرے حاشیے کی طرف فی الحال بڑھے یا نہ بڑھے۔ لڑکے نے یک بارگی ایک وحشی چیخ ماری اور سفید سفید دانت نکوستا اور اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی کیکر کی ایک لمبی سی چھڑی کو ہوا میں لہراتا ہوا توڈے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ شمال کی اور سے آنے والی سرد ہوا، اس کے چہرے سے

ٹکرا کر، عقبی ٹیلوں کے پیچ و خم میں چھوٹی چھوٹی گھمن گھیریاں کھاتی ہوئی ایک ہلکا ہلکا، پُراسرار سا شور پیدا کرنے لگی۔ ٹوبے کے ارد گرد پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں آرام کرتی ہوئی کونجوں کا ایک جھرمٹ پھڑ پھڑا کر اٹھا اور کچھ بلندی پر جا کر فضا کی نیلاہٹ میں سخت کاہلی کے ساتھ جھولنے لگا، گویا جو خطرہ بھی تھا زمین پر تھا، اب نیلگوں بلندیوں پر کوئی خوف نہیں۔

ٹوبے کے جنوب، مغرب اور مشرق میں ریت کی اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں۔ شمالی اُور بالکل خالی تھی۔ سرما میں اس طرف سے ٹھنڈے، یخ جھونکے آتے اور ٹوبے کی پُرسکون سطح پہ لہریں اُبھارتے ہوئے صحرا کی لامحدود پہنائیوں میں، نئے جھونکوں کی آمد تک، محو رقص رہتے۔ جب مہاوٹ برستی تو ٹوبے کے تین طرف پھیلے ہوئے بھورے ٹیلوں سے پانی کی کئی منی منی نالیاں اُترتیں اور سبز، حاشیہ لگے کناروں کی کانٹ چھانٹ کرتی ہوئی ٹوبے کی گہرائیوں میں آپ ہی آپ دفن ہو جاتیں۔

لڑکے نے زمین پر پڑی ہوئی تین چار سوکھی ٹہنیاں اٹھائیں اور انھیں ٹوبے میں پھینکنے لگا ...... لہر کے بعد لہر اٹھی اور ٹوبے کی خاموش سطح دق کے کسی سانس لیتے مریض کی پسلیوں کی ایسی ہو گئی ...... لڑکا فرطِ مسرت میں زور زور سے وحشی چیخیں مارنے لگا۔ چیخوں کی بازگشت صحرا میں دُور دُور تک سنائی دیتی رہی۔ اور جب وہ اس کھیل سے اُکتا گیا تو اسی طرح چیخیں مارتا

ہوا اپنے توڈے کی طرف بھاگ گیا۔

توڈے کے پاس آکر اس نے لاڈ میں اس کی پیٹھ پر چھڑی کے پے بہ پے کئی وار کیئے۔ توڈے نے اپنی مختصر سی دُم ہلانے کے علاوہ کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا اور گردن اٹھا کر اسی پگڈنڈی کی جانب چل پڑا جو ٹیلوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی سچن ڈھوک میں جا نکلتی تھی۔

لڑکا بھاگتے توڈے کی دُم کے سہارے اس پر سوار ہونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ معاً ایک کونج نہ جانے کہاں سے آئی اور اس کے سر پر پھڑ پھڑانے لگی...... اس کی گردن کا تناؤ دیکھنے کے قابل تھا اور اس کی ٹانگوں کی نارنجی رنگت، نرم روشنی میں بہت صاف دکھلائی پڑ رہی تھی۔ یہ صحرائی کونج نہیں تھی شاید کسی اور علاقے سے آئی تھی اور اپنی ڈار سے بچھڑ کر اُس نے یہیں کہیں بسیرا کر لیا تھا۔ لڑکے نے سر اٹھا کر دیکھا تو کونج نے ایک غوطہ کھایا اور ٹوبے کی طرف چلی گئی۔ ٹوبے پر اس نے کئی چکر کاٹے اور ہر چکر پر نیچے آتی گئی۔ اور پھر پروں کی ایک اعصابی پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ، وہ سطحِ آب کے اس قدر نزدیک آگئی کہ اس کے پنجے پانی کو چھونے لگے اور پنجے کے ہر لمس کے ساتھ شفاف لہروں کی کئی نقرئی محرابیں بن بن کر ٹوٹنے لگیں ..... وہ خاموش کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے کونج کو ٹوبے کی دوسری طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا..... ٹوبے کے عین درمیان چکنی مٹی کا ایک

تودا اُبھرا ہوا تھا..... اس چھوٹے سے جزیرے کو اونچی نیچی، صحرائی جھاڑیوں کے ایک گھنے جھنڈ اور لمبی گھاس نے ڈھانپ رکھا تھا..... کونج اپنے خاکستری جسم کے ساتھ، کہ پتھر کا ایسا ٹھوس دکھلائی پڑ رہا تھا، رینگتی ہوئی ان جھاڑیوں میں غائب ہو گئی..... لڑکا دبے دبے قدم اٹھاتا، ٹوبے کے کنارے کنارے، اس جگہ کی مخالف سمت میں آ گیا جہاں سے اس نے پہلے پہل کونج کو دیکھا تھا..... اُبھرے ہوئے تودے کی جھاڑیوں میں سرسر ہوا سنسنا رہی تھی اور ان کے مٹیالے سائے ٹوبے کے پانی پر کانپ رہے تھے..... اس کنارے سے چکنی مٹی کے تودے تک چند گز کا فاصلہ تھا اور درمیان میں پانی کی ایک چھوٹی سی، قوس نما لکیر حائل تھی..... اس فاصلے میں پانی کی گہرائی زیادہ نہیں تھی اور ذرا احتیاط سے کام لے کر بڑی آسانی سے جزیرے تک پہنچ سکتا تھا۔

اس نے اپنی دھوتی اتار پھینکی اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا پانی میں داخل ہو گیا..... نیچے کی سطح دلدلی تھی اور اسے جسم کا توازن قائم رکھنے کے لیے ادھر ادھر ڈولنا پڑتا تھا..... پانی برفاب کا ایسا ٹھنڈا تھا..... وہ جزیرے کے قریب پہنچا ہی چاہتا تھا کہ اس کا ایک پاؤں نیچے کی دلدل میں بری طرح دھنس گیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور شڑاپ سے پانی میں گر گیا اور بوکھلا کر ہاتھ پیر مارنے لگا..... اس کے گرتے ہی، شاید

پانی کے شور سے خوفزدہ ہو کر، کونج جھاڑیوں میں سے پھڑپھڑا کر اُڑی اور شام کی ارغوانی روشنی میں اپنے خاکستری پروں کو تیزی سے جھلاتی ہوئی، مشرقی ٹیلوں کی نقرئی چوٹیوں کے اوپر سے ہوتی ہوئی، وہاں غائب ہو گئی جہاں زمین و آسمان ایکدوسرے کو چومتے ہوئے محسوس ہوتے تھے ...... لڑکا بڑی مشکل سے سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور خوفزدہ سا چند لمحوں تک یونہی کھڑا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور جزیرے تک پہنچ گیا .... وہاں لمبی گھاس اور جھاڑیوں میں کونج کے کئی چھوٹے چھوٹے، نرم نرم پر اُلجھے ہوئے تھے۔

اس نے لمبی گھاس کو ہاتھوں سے ایک طرف ہٹا ہٹا کر ہر جھاڑی میں جھانکا، اپنی انگلیوں کو سرکنڈوں کے، چاقو کی دھار ایسے، کٹیلے پتوں اور جھاڑیوں کے نوکیلے کانٹوں سے زخمی کیا، تب کہیں جا کر اسے کونج کا گھونسلا ملا ..... گھونسلے کا رُخ شمال کی طرف تھا اور یہ دَن کی ایک جھاڑی کی گنجان ٹہنیوں کے درمیان، سوکھے تنکوں، سوکھے پتوں اور ٹوٹے پروں سے تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں ایک انڈہ یوں پڑا تھا جیسے سیپ کی گود میں بڑا سا موتی ..... وہ خوشی سے اُچھل پڑا ..... اس نے تیز آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا .... .... دور دور تک نظروں کی زد میں کوئی نہ تھا ...... اس گھونسلے کا اب وہ تنہا مالک تھا ...... اس نے آہستگی سے انڈہ اٹھا لیا .... یہ چیت کے آسمان کا ایسا بے داغ اور نیلگوں تھا اور اس نیلاہٹ میں ایک ہلکی سی

آمیزش شام کی ارغوانی روشنی کی تھی۔۔۔۔ معاً اسے احساس ہوا کہ گھونسلے میں سے انڈہ اٹھا کر اس نے اچھا نہیں۔۔۔۔ اس نے اسے دوبارہ گھونسلے کی نرم آغوش میں رکھ دیا۔۔۔۔ اس نے چن ڈھوک کے لمبی لمبی داڑھیوں والے بوڑھوں سے سُنا تھا کہ اگر کسی پرندے کے انڈے کو ایک دفعہ چھُو لیا جائے تو پرندے کی مادیں اس انڈے کو سینا ترک کر دیتی ہے۔

"تو کیا اب یہ کونج بھی اس انڈے پر بیٹھنا چھوڑ دے گی؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور اس پر ایک انجانی سی اداسی چھا گئی۔۔۔۔ اُسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھوں ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔۔۔۔ وُہ جلدی سے مُڑا اور پانی میں گھر تا پڑتا ٹوبے سے باہر آ گیا اور دھوتی اٹھا کر، کمان میں سے نکلے ہوئے تیر کے مانند، اپنے ٹوڈے کے پیچھے بھاگ گیا۔۔۔۔ سورج اب پوری طرح غروب ہو چکا تھا اور گہری ہوتی ہوئی شام کے دھندلکوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے کر اس کے جسم میں خنکیاں اور دل میں اداسیاں اتار دی تھیں۔

اگلے دن جب چن ڈھوک کے افق پر صبح کا تارا نمودار ہوا اور ادنوٹں نے چارے کے لئے بلبلانا شروع کر دیا تو وہ اٹھا اور حسب معمول اپنے ٹوڈے کو چرانے باہر نکل گیا۔۔۔۔ رستے میں اسے ڈمرو مل گیا۔۔۔۔ وہ اس کا ہم عمر تھا اور چن ڈھوک کی سب سے زیادہ غصیلی ماں کا بیٹا تھا۔۔۔۔ وہ بھی

اس وقت اپنے دو میمنوں (بکری کے بچے) کو چرانے باہر نکلا کرتا تھا۔

اس کے دل و دماغ پر اب تک اس اکیلی کونج کا گھونسلہ چھایا ہوا تھا، چنانچہ اس نے چھوٹتے ہی ڈمرو سے کہا:

"اوڑے ڈمرو، اوڑے ماں کپتی تھیوے (ماں مرے.... مروٹ کے لوگوں کا عام تکیہ کلام)..... مجھے ایک گھونسلہ ملا ہے..... کسی اکیلی کونج کا گھونسلہ"

"اور تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ کونج اکیلی ہے؟" ڈمرو نے قدرے حاسدانہ لہجے میں پوچھا۔

"اوڑے گیدڑ کی اولاد، میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ مروٹ کی کونج نہیں ہے۔ کسی اور علاقے سے آئی ہے اور شاید اپنی ڈار سے بچھڑ کر اکیلی رہ گئی ہے..... اس کے پروں کا رنگ مٹ میلا ہے۔ جو نیچے اور پیچھے کھٹے رنگ کے ہیں۔ اور وہ......"

"کہاں ہے اس کا گھونسلا؟" ڈمرو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تجھے نہیں بتاؤں گا..... تو اوّل درجے کا حرامی ہے۔ بھلا وہ گھونسلا تو صحیح سالم چھوڑے گا۔"

"جا اوڑے جا، بڑا آیا وہاں سے گھونسلے والا... کیا پتہ وہ یہیں کی کسی بڈھی کونج کا گھونسلا ہو۔"

ڈمرد کی اس بات پر اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے اپنی سُرخ زبان نکال کر اس کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔ "تجھے بڑا پتہ ہے ...۔ اوئے سُور کے بچے، اس کا انڈا میں نے اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھا ہے۔ یہاں کی کونجوں کے انڈوں پر کالی چتّیاں ہوتی ہیں۔ اس کونج کا انڈا بالکل صاف تھا۔ اس کا رنگ نیلا تھا، جیسا آسمان کا رنگ ہوتا ہے۔"

اور پھر ڈمرو نے وہی کہا جو وہ سننا نہیں چاہتا تھا.... "چل مان لیا کہ وہ کسی اور علاقے کی کونج ہے۔ لیکن اس کے انڈے کو تُو نے ہاتھ سے چھُوا تھا نا.... بس اب وہ اس انڈے پر نہیں بیٹھے گی .... نہیں بیٹھے گی .... نہیں بیٹھے گی۔"

یہ کہہ کر ڈمرو اپنے میمنوں کو ہانکتا ہوا، ستاروں کی دھیمی روشنی میں آگے بڑھ گیا۔

اُسے یوں لگا جیسے وہ رو پڑے گا یا زور زور سے چیخیں مارنے لگے گا۔ .... اس کا دل اندر سے کہہ رہا تھا کہ ڈمرو نے ٹھیک بات کہی ہے ... ... وہ اب اس انڈے کو سینا چھوڑ دے گی ..... لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے آپ کو شکست قبول نہ کرنے پر آمادہ کر لیا..... نہیں وہ ضرور اپنے انڈے پر بیٹھے گی .... ضرور بیٹھے گی .... مجھے پتہ ہے ضرور بیٹھے گی۔

لیکن جب سورج اُبھرا اور ابھر کر اڈتی ہوئی سیاہ گھٹا کے پیچھے غائب ہو گیا اور وہ بارش کی تیز بوچھاڑوں سے بچنے کی خاطر کریر کی ایک چھتری نما جھاڑی کے نیچے چھپ گیا اور اس کا توڈا بوکھلا کر ڈھوک کی طرف بھاگ گیا، تو اس کا یقین پھر متزلزل ہونے لگا۔

وہ جھاڑی کی باہم گتھی ہوئی شاخوں کے سائبان تلے بیٹھا تھا۔ سرما کے بادلوں سے، پانی تہ در تہ صحرا کی بے کراں وسعتوں میں اُتر رہا تھا اور وہ چپ چاپ، گم سم بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ٹوبے کی سطح پر ابھرتے، ٹوٹتے بلبلوں کا تماشا لگا ہوگا۔ گھونسلے میں خنک نمی پھیل گئی ہوگی۔ کونج اپنے پَروں میں چونچ دیئے خاموش بیٹھی بارش ختم ہونے کا انتظار کر رہی ہوگی اور اس کا انڈہ...... انڈہ...... وہ چونک پڑا اور سر کے ایک زوردار جھٹکے سے ساری سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر موسلادھار بارش میں ہی ڈھوک کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

گھر میں آج گیدڑ کا گوشت پکا تھا۔ اسے بھوک قطعاً محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے تھوڑا بہت گوشت زہر مار کیا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا پھر باہر نکل آیا...... ساری وادی، مسلسل نازل ہوتی ہوئی بارش کی دبیز دھند میں چھپی ہوئی تھی...... وہ بھاگتا ہوا ٹوبے پر پہنچ گیا اور شمالی کنارے کی طرف سے پانی میں داخل ہو گیا...... بارش کی بوچھاڑ اور تیز ہوا اُس کے

چہرے پر طمانچے مار رہی تھی اور اس مختصر سے جزیرے پر اُگی ہوئی جھاڑیوں میں ایک کے بعد ایک برستی ہوئی بوندیں شور مچا رہی تھیں۔ پرلے کنارے پر شاید کوئی اکیلا مینڈک اپنی تنہائی سے اُکتا کر زور زور سے ٹرّا رہا تھا۔

وہ اسی طرح، ڈگمل ڈگمل کر اپنے جسم کا توازن قائم رکھتا ہوا جزیرے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کا دل ایک انجانے سے ولولے سے اچھل رہا تھا ...... وہ کوئی شور پیدا کئے بغیر، جزیرے پر چڑھ گیا اور لمبی گھاس کو بازوؤں کی حرکت سے ایک طرف ہٹاتا ہوا، گھونسلے کی طرف بڑھنے لگا .... آنے والے لمحے کے خوف سے اس کا ہر پٹھا بری طرح اکڑ گیا تھا۔ اس نے وَن کی جھاڑی کی گنجان ٹہنیاں پرے کر کے، بڑی آہستگی سے ایڑیاں اٹھا کر گھونسلے کے اندر جھانکا ..... وہ چپ چاپ بیٹھی تھی ..... اس کے پر پھولے ہوئے تھے اور اپنی چونچ کو اس نے اپنی چھاتی کے پروں میں چھپایا ہوا تھا، جیسے سو رہی ہو ...... لڑکے کا دل اچھل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا ...... وہ چوروں کی طرح، بنا کسی آہٹ کے، مڑنے ہی والا تھا کہ کونج کے حساس کانوں نے ٹہنیوں اور پتوں کی سرسراہٹ سُن لی اور اپنی لمبی گردن اٹھا کر جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر پر تولتی ہوئی، زور سے پھڑپھڑا کر اٹھی اور غربی ٹیلوں کی جانب اُڑ گئی ..... ایک گناہ کا احساس لڑکے پر چھا گیا ..... وہ جانے کے لئے مڑا ..... رُکا ..... اور وَن کی گھنی ٹہنیوں کے درمیان، ہولے ہولے

جھولتے ہوئے، خالی گھونسلے کو دیکھنے لگا..... ایک دفعہ اور اس کے اندر جھانک لینے میں کیا ہرج ہے۔ وہ دوبارہ وَن کی جھاڑی کی طرف بڑھا اور ٹہنیاں ہٹا کر گھونسلے میں جھانکنے لگا..... وہاں ایک انڈے کی بجائے اب دو انڈے پڑے تھے۔

اس نے خوشی سے جھوم کر ایک وحشی چیخ ماری اور مڑ کر ٹوبے میں کُود گیا:

# احساس

مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا... کیوں ہوا... بہرحال ہو گیا۔

ابھی ابھی وہ میرے ساتھ بیٹھی تھی، میری انگلیاں اس کے گدر گدر بازو کو چھو رہی تھیں اور دوسرے لمحے وہ غائب تھی، چلی گئی تھی..... اُسے میں کیا کہوں؟.... ایک حادثہ.... ایک واقعہ..... ایک المیہ، یا محض زندگی کا ایک آخری عمل....؟

وہ بہاولنگر کے اسٹیشن سے میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کی شمعی انگلیاں کمپارٹمنٹ کے شیشے چڑھے دریچوں پر ہولے ہولے کانپ رہی تھیں اور وہ مستقل باہر دیکھ رہی تھی..... ریت کے گھومتے ٹیلوں اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ بھاگتے درختوں کی طرف..... فضا میں دھندلاہٹ نام کو نہ تھی۔ ستارے بے حد قریب اور شگفتہ دکھلائی پڑ رہے تھے۔ لیکن

ریت کے ٹیلوں کے درمیان آباد صحرائی دیہات کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی روشنی دھندلائی ہوئی اور دُور تھی۔

"انھوں نے مجھے کہا کہ اب میں اپنی بچی کو دوبارہ دیکھنے کی کوشش نہ کروں۔" اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ "اور پھر انھوں نے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ میں باہر اکیلی کھڑی رہی۔ لیکن میں ہمیشہ کے لئے وہاں اکیلی کیسے کھڑی رہ سکتی تھی،..... میں وہاں سے چلی آئی۔"

لیکن اب اس کی ساری باتیں دُہرانے سے فائدہ؟۔ مجھے اس کی ہر ایک بات یاد بھی تو نہیں رہی۔ اور پھر یہ کہ کئی باتیں اَن کہی تھیں۔ اس نے یہ کہانی شروع سے سنائی ہی نہ تھی۔ اوّلیں الفاظ جو اس نے کہے، یہ تھے:

..... "جب بچی پیدا ہوئی تو میں سولہ برس کی تھی"..... اس کے بعد اس نے جو کچھ کہا، وہ کچھ اُور تھا..... یہ میری حماقت ہوگی کہ میں اس کے فقروں کو ترتیب دینے کی کوشش کروں..... اس کی اکھڑی اکھڑی باتوں کو ترتیب دینا ناممکن ہے اور اگر ممکن بھی ہو تو ڈبی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے بلب کی مدّھم مدّھم اور مدقوق روشنی میں ادا کیے گئے ان فقروں، ان لفظوں، ان باتوں کو واضح معنیٰ نہیں پہنائے جا سکتے۔ ان سے کوئی مطلب اخذ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہوا کے آوارہ جھونکوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑنے کی ناکام سعی..... ان لفظوں اور فقروں سے کئی انمل بے جوڑ کہانیاں

بنائی جا سکتی ہیں لیکن کوئی نہیں جو انھیں ایک منطقی ترتیب دے سکے.... وہ باتیں اُن جامنوں کے مانند ہیں جن کو نمک مرچ ملا کر اور ڈبے میں زور زور سے ہلا کر مزیدار تو بنایا جا سکتا ہے، ایک لڑی میں نہیں پرو دیا جا سکتا۔

میں اس کی باتیں دہرانے کی کوشش نہیں کر رہا اور نہ ہی میں نے وہ سب کچھ سننے کی کوشش کی، جو کچھ اس نے کہا۔ بلکہ جو کچھ میں نے سنا وہ بھی ناقابلِ سماعت تھا۔

"وہ لوگ بہاولنگر کے ایک سرخ چھتوں والے دو منزلہ مکان میں رہتے ہیں۔ مکان کا صحن بہت بڑا ہے اور اس میں کھجور کے تین اونچے اونچے درخت ہیں"..... یہ کہہ کر اس نے پھر وہی بات کہی: "جب بچّی پیدا ہوئی تو میں سولہ برس کی تھی۔"

اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ بچّی کی پیدائش اسی دو منزلہ مکان میں ہوئی ہوگی، جس کی چھتیں سُرخ تھیں اور جس کے صحن میں کھجور کے تین اونچے اونچے درخت تھے..... لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا..... بچّی نے زنانہ ہسپتال میں جنم لیا تھا، جو اس مکان کے جنوب میں، ریلوے لائن کے پار، ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے قریب واقع تھا..... اب بتائیے میں کیا کروں؟..... اس کی باتوں سے کئی اندازے لگائے جا سکتے ہیں، جو غلط بھی ہو سکتے ہیں اور صحیح بھی..... حقیقت صرف ایک تھی..... اور وہ یہ کہ اس نے

مجھ سے بہت سی باتیں کیں، وہ سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھی رہی، اس کی ننھی انگلیاں کمپارٹمنٹ کے شیشے چڑھے دریچوں پر کانپتی رہیں اور پھر وہ چلی گئی۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا، کیوں ہوا۔

اس نے مجھے وہ سب کچھ بتایا جو بتایا جا سکتا تھا، جو وہ بتانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ بچی اس سے چھین لی گئی تھی اور اس کے خاوند نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

"میں نے اسے کبھی دھوکہ نہیں دیا۔" اس نے کہا۔ "لیکن وہ مجھ سے اُکتا گیا تھا۔ اسے ایک اور لڑکی پسند آ گئی تھی۔ وہ اب اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ بات اگر یہیں تک رہتی تو کوئی حرج نہیں تھا۔۔۔۔ مجھے اس سے محبت تھی۔۔۔۔ اگر وہ مجھے چھوڑنا چاہتا تھا تو میں اس کو روک نہیں سکتی تھی۔ لیکن انھیں بچی کو مجھ سے چھیننے کا کوئی حق نہیں تھا۔۔۔۔ وہ میری بچی تھی۔۔۔۔ میں اس کی ماں ہوں۔"

یہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، اس میں جھوٹ کا شائبہ تک نہیں۔۔۔۔۔ جھوٹ الفاظ سے بولا جاتا ہے اور جو کچھ میں لکھ رہا ہوں، اس میں الفاظ کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں الفاظ گونگے ہو جاتے ہیں۔

اس وقت جب وہ یہ سب کچھ بتا رہی تھی تو مجھے چاہیئے تو یہ تھا کہ میں اس کی کوئی نہ کوئی مدد کرتا، اسے کم از کم اتنے روپے ہی دے دیتا کہ وہ کسی وکیل کو فیس ادا کر کے اس معاملے کو عدالت میں لا سکتی یا خود ڈپٹی کمشنر کو

مل کر اسے اس کا حق دلوانے کی کوشش کرتا . . . لیکن میں نے اسے کسی قسم کی مدد کی پیشکش نہیں کی . . . . . میں نے اسے وکیل کی فیس کے لئے روپے بھی نہیں دیئے۔ اس کے لئے ڈپٹی کمشنر کو ملنے کا خیال بھی میرے ذہن میں نہ آیا۔ میں تو بس اس کے قریب بیٹھا اس کو دیکھتا رہا اور میری انگلیاں اس کے گدڑ گدڑ بازو کو چھوتی رہیں۔

"بچی میری ہے"۔ اس نے کہا۔ "میں اس کی ماں ہوں۔ میں نے اس کو نو مہینے تک اپنے پیٹ میں خون پلا پلا کر پالا تھا۔ اس کی پیدائش کے جان لیوا درد میں نے سہے تھے۔ اس نے نہیں جس نے چھوڑ دیا۔ اور میں نے تو اس سے بھی کبھی دغا نہیں کی۔"

گاڑی ڈھاپ سنتیکا کے اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ بولائے ہوئے اجڈ دیہاتی ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے ہمارے کمپارٹمنٹ کے قریب سے گذر رہے تھے۔ ویران اسٹیشن کے پرلے کونے پر بڑی آہستگی کے ساتھ جلتا ہوا کیروسین لیمپ سرد ہواؤں میں زرد روشنی کی بیمار لہریں بکھیر رہا تھا۔ اور وہ سکے جا رہی تھی:

"میں اپنی بچی سے اب کبھی نہ مل سکوں گی . . . . . وہ مجھے نہ دیکھ سکے گی . . . . وہ لوگ اسے بتا دیں گے کہ اس کی ماں کوئی اور ہے۔ لیکن وہ میری بچی ہے۔ میں اس کی ماں ہوں۔"

اس سمے اس کی باتوں سے میں قطعی جذباتی نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے کئی بار عورتوں کی باتیں سنی ہیں۔ ان کے بچوں کی باتیں، ان کے شوہروں کی باتیں، ان کے عاشقوں کی باتیں۔ غرضیکہ اس ہر شے کی باتیں جس کے متعلق یہ صنف باتیں کر سکتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی عورت مجھ سے یہ کہتی ہے کہ اس نے مجھ سے شادی کی بھیک مانگی تاکہ ہم ساری عمر کے لئے اکٹھے رہ سکیں۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں۔ بس کھڑا حیران ہوا کرتا ہوں ..... اور اس نے بھی یہی کہا تھا:

"اس نے مجھ سے شادی کی بھیک مانگی تھی تاکہ ہم ساری عمر اکٹھے رہ سکیں ..... اور جب میں نے اس کی پھیلی ہوئی جھولی میں اپنی ساری زندگی ڈال دی، تو وہ مجھے چھوڑ گیا۔ وہ کہتا تھا کہ جتنی خوشی اسے وہ چھنال دے سکتی ہے، میں نہیں دے سکتی۔ اگر وہ مجھے یہ بتا دیتا کہ وہ خوشی کیا ہے، کس قسم کی ہے تو میں بھی اسے ویسی ہی خوشی دینے کی کوشش کرتی۔ لیکن اس نے تو کبھی بتایا ہی نہیں۔"

اور جب اس نے تھرماس کھول کر مجھے گرم چائے پینے کی دعوت دی تو میں نے سوچا کہ بائیس برس کی اس لڑکی کو، جس کی آنکھوں میں چراغ سے فروزاں ہیں، جس کے ہونٹوں پر گلاب کی کچی کلیوں کی سرخی ہے، جس کے بال اس قدر سیاہ ہیں کہ کھول دے تو دھرتی پر شام اتر آئے، جس کے گال

پر شفق کی رنگین کہانیاں رقم ہیں، اس کو اس وقت بہاولنگر اور ہارون آباد کے درمیانی راستے میں مجھے اپنے دکھڑے سنانے کی بجائے کنیرڈ کالج کی شوخ طالبہ ہونا چاہیئے تھا ..... لیکن کنیرڈ کالج کی وہ شوخ طالبہ جاہل مطلق تھی اور سرڑ سرڑ کر کے چائے پی رہی تھی ..... ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی جاہل لڑکی جس کو یہ تو معلوم تھا کہ سردیوں کے سفر میں چائے کا تھرماس ساتھ ہونا چاہیئے، لیکن جسے چائے پینے کی تمیز نہ تھی ... جو ریل کے تھرڈ انٹر، سیکنڈ اور فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کا فرق تو جانتی تھی، مگر یہ علم نہ رکھتی تھی کہ زندگی کی ریل میں کمپارٹمنٹوں کی تخصیص نہیں ہوتی .....

اس کی ہر بات تسلسل سے عاری تھی۔ مجھے وہ ایسے قدیم مسوّدے کی مانند دکھلائی پڑی جس کے کئی اوراق دیمک نے چاٹ لیے ہوں، اور جس کے مضمون کی گم گشتہ کڑیاں کوئی بھی محقق دریافت نہ کر سکا ہو۔

وہ ہارون آباد جا رہی تھی۔ وہاں اس کے میکے تھے۔ اب ہارون آباد شاید اس کی آخری منزل تھی .... لیکن وہاں جا کر بھی وہ کیا کرے گی؟ .... سوتیلی ماں کے برتن مانجھے گی۔ بھاوجوں کے طعنے سُنے گی .... اس کے پاس کُل دس روپے تھے اور ایک تھرماس تھا .... پانچ روپوں میں اس نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا تھا۔ ایک روپے کی تھرماس میں چائے بھروالی تھی .... بقیہ چار روپوں میں وہ اپنی ساری زندگی گذار لے گی؟۔

اسے نوکری ملازمت کرنا بھی نہیں آتی تھی اور اگر بفرضِ محال کر بھی لے تو لوگ جان کھا جائیں گے ...... اتنے بڑے گھرانے کی باپردہ لڑکی اور نوکری؟ .... اگر اس کی بچی اس کے پاس رہ جاتی تو پھر شاید وہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتی۔ لیکن اب جبکہ کوئی نہ تھا، جس کے لیئے زندہ رہا جاسکے، تو وہ کیا کرے؟

"اب مجھے اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کہ زندگی میرے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے"۔ اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "اب کچھ بھی ہو میری بلا سے۔ فی الحال میں چند لمحوں کے لیئے ہر غم بھول جانا چاہتی۔ اگر چند لمحوں کے لیئے یہ خوشی میسر آگئی تو میں مطمئن ہو جاؤں گی .... میں نے پہلے کبھی کسی غیر مرد سے اس طرح گفتگو نہیں کی۔ شاید اس لیئے کہ کبھی اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ شاید اس لیئے کہ ان چیزوں کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا.... میں نے اپنے خاوند سے کبھی دغا نہیں کی ..... میں نے کبھی وہ کام نہ کیا جو اس کو ناپسند تھا اور اب مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں صرف چند، مختصر سے لمحوں کے لیئے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں ..... اگر کوئی بیہوشی کی دوا مل جائے تو اچھا ہے ..... لیکن یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں۔ بے ہوشی سے میرا بوجھ ہلکا نہیں ہو سکتا ..... میں چاہتی ہوں کہ میں خوش بھی ہو جاؤں اور خوشی کو محسوس بھی کر سکوں ...... بغیر احساس کے بے ہوشی کی خوشی کس کام کی؟"

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ کچھ نہ بولا۔ اس کو تسکین دینے کے لئے کوئی ہمدردانہ بات نہیں کی.... بس دیکھتا رہا، اس کے چہرے کو۔ بس جھانکتا رہا اس کی آنکھوں میں..... اس کے لب ہلتے رہے۔

"وہ حرافہ جس کے ساتھ اس نے دوسرا نکاح کر لیا ہے، اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتی ہے۔ وُہ دونوں شراب پی کر سوتے ہیں۔ اگر وہ مجھے کہتا تو اس کے لئے، اس کی خوشی کے لئے، میں بھی شراب پینے لگتی۔ لیکن یہ کیا خبر کہ اس طرح بھی وہ خوش ہوتا یا نہیں.... میری محبت ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بہت بلند تھی..... بہت پائدار..... بہت مضبوط.... اس محبت کے لئے اگر میں اپنے جسم کا ایک ایک حصہ بھی چیر کر اس کے آگے رکھ دیتی تو مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی..... کوئی دکھ نہ ہوتا۔"

میں حیران تھا کہ کروں تو کیا کروں؟.... وہ اپنے خاوند اور بچّی سے دوبارہ ملنے کی تمام امیدیں ختم کر بیٹھی تھی۔ اور اب اسے قطعاً کوئی پرواہ نہ تھی کہ زندگی اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ وہ چند لمحوں کی خوشی حاصل کرنا چاہتی تھی اور اس خوشی کو محسوس بھی کرنا چاہتی تھی۔ احساسِ مسرت کا حصول اس وقت اس کی پہلی اور آخری تمنا تھی.... خواہ اس احساس کا وقفہ بہت مختصر ہی کیوں نہ ہو...... اور شاید اسے اس احساس کو پانے کا ذریعہ بھی معلوم تھا۔

"وہ دو دو تین تین ہفتے گھر سے غائب رہتا تھا اور جب آتا تو مجھے کہتا کہ میں تم سے تنگ آچکا ہوں، مجھے اکیلا چھوڑ دو.... اس کی ان باتوں سے میرے دل پر جو زخم لگتے تھے، وہ میں ہی جانتی تھی۔ لیکن میں یہ سب کچھ برداشت کرتی چلی گئی۔ چونکہ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ اور بچی میرے پیٹ میں تھی.... مجھے وہ اور بچی دونوں اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھے۔"

یا خدا ___ میں اسے کیا کہتا.... کیا کہہ سکتا تھا.... میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والا، جس کا واحد مشغلہ جنگلی پھول جمع کرنا تھا، یہ کیوں کر جان سکتا تھا کہ ایک لڑکی کو جب بھری جوانی میں تنہا رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے تو وہ کیا محسوس کرتی ہے؟

سارا معاملہ یوں خلط ملط تھا، جیسے کسی خشک جھیل کی تہ میں کئی بیلیں سوکھ کر باہم بُری طرح اُلجھ جائیں۔ مجھے اس لڑکی کی گمبھیر کہانی احساسات کے ایک پُر اسرار، موہوم اور ناقابلِ یقین ڈھانچے کی سی محسوس ہو رہی تھی...

...اور جب اس نے وقت پوچھا تو میں اور وہ، دونوں یہ جانتے تھے کہ وقت کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وقت کو ہمارے وجود، اعمال اور گفتگو سے کوئی سروکار نہیں.... گھڑی کا چہرہ محض گذراں لمحوں کی یاد ہے۔ ایک آئینہ جس میں ہم ماضی کا عکس دیکھتے ہیں.... ایک.... دو.... پانچ...

.... دس .... وقت گذرتا رہتا ہے۔ ہمیشہ گذرتا آیا ہے اور ہمیشہ گذرتا رہے گا .... کہیں بچی نے سہمتے ہوئے، ہاتھ پاؤں مار کر چادر نہ اتار پھینکی ہو.... اس پر رضائی ڈال دو .... سردی بہت ہے .... ایسا نہ ہو کہ ننھی سی جان کو نمونیہ ہو جائے۔

لیکن یہ میرے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں۔ میرا دل کیوں اس بُری طرح دھڑک رہا ہے .... یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے .... وہ سیٹ پر میرے قریب بیٹھی ہے .... کبھی روتی ہے، کبھی ہنستی ہے .... روتی ہنستی چڑیا .... گاڑی چل رہی ہے .... انجن کے سینے سے دھواں اُٹھ رہا ہے .... تاریکی میں لپٹے ہوئے کھیت اور ریت کے ٹیلے گھوم رہے ہیں .... اس کی چھنگلیا میں ایک نگینہ جڑی انگوٹھی چمک رہی ہے .... یہ سب کچھ ایک ٹھوس حقیقت ہے .... میں اس حقیقت کو محسوس کر سکتا ہوں، چھو سکتا ہوں، ناخنوں سے اس حقیقت کے سینے پر خراشیں ڈال سکتا ہوں، اس کو پاؤں تلے روند سکتا ہوں۔

"پھر میں اسٹیشن پر آ گئی .... ٹکٹ خریدنے میں آدھ گھنٹہ لگ گیا، چونکہ کھڑکی پر بے حد ہجوم تھا۔ اور فرسٹ کلاس کا ڈبہ ڈھونڈنے میں تو گاڑی ہی نکل جاتی، اگر ایک قلی مجھے نہ بتاتا۔"

یہ سب کچھ کیسے ہوا .... ؟ .... میں، جس نے اسے پہلے کبھی نہ

دیکھا تھا، جو اسے پھر کبھی نہ دیکھے گا.... میں کیسے اس کمپارٹمنٹ میں اس کے قریب اس سیٹ پر آبیٹھا... کیا مجھے اور کوئی کمپارٹمنٹ نہ ملا تھا... کیا میری ہم سفر اور کوئی لڑکی نہ ہو سکتی تھی؟

"مار ڈالو مجھے .... خدا کے لئے قتل کر دو.... مجھے زندہ نہ چھوڑو ..... دعائیں دوں گی تمھیں، میرے جسم کا ہر عضو کسی تیز چاقو سے الگ الگ کر دو...."

یکایک اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور میں نے گھبرا کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایسا رونا میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایسی غضب ناک سسکیاں میں نے پہلے کبھی نہ سُنی تھیں.... مجھے اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اسے چپ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی دلگداز سسکیاں ہر لمحے بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باقاعدہ رونے لگی۔ میں نے جلدی سے اس کے منہ پر تولیہ لپیٹ دیا۔ اس نے اپنے نکیلے ناخنوں سے میرا چہرہ زخمی کر دیا..... وہ پاگل ہو گئی تھی۔ اگر اُس وقت کوئی ٹکٹ چیکر اس کمپارٹمنٹ میں آنکلتا تو ایک اکیلی عورت پر دست درازی کے الزام میں مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا.... میں تنگ آکر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور بوکھلاہٹ میں سیگرٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لگانے لگا۔

چند لمحوں کے بعد وہ معاً خود بخود چُپ ہو گئی۔

"اس نے مجھ سے شادی کی بھیک مانگی اور جب میں نے کہا کہ ایسی بھی کیا جلدی ہے تو وہ بچوّں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا...... سنتے ہو، ایک اچھا خاصا مضبوط مرد بچوّں کی طرح رونے لگا۔"

ایک مختصر سا لمحہ ــــــ

"اور پھر شادی کے بعد ہم سرخ چھتوں والے اس دو منزلہ مکان میں رہنے لگے، جس کے صحن میں کھجور کے تین اونچے اونچے درخت تھے.... ... ہمارے رات اور دن ایک نشے کے سے عالم میں گذر رہے تھے ..... اور سنو ــــ جب میں رونے لگوں تو مجھے چُپ کرانے کی کوشش نہ کرنا..... ہنسنا یا رونا اب میرے بس میں نہیں رہا۔"

میں چپ چاپ بیٹھا رہا..... وہ کہتی رہی،

"ہم نے دو سال تک ایک دوسرے سے اتنی محبّت کی کہ سب کچھ بھول گئے..... ایک رات وہ شراب کے نشے میں دھت گھر آیا اور کہنے لگا کہ میں تم سے اُکتا چکا ہوں..... اس نے اس چھنال کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ اس نے مجھے عورت کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سُنائیں جو میں نے کبھی نہ سُنی تھیں.... پھر وہ چلا گیا۔ اور ایک دن یوں ہوا کہ اس نے مجھ سے بچّی چھین لی اور مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ میں نے اپنی سانس اور

نندوں کی بہت منت سماجت کی لیکن انھوں نے بھی ایک نہ سنی۔ میں بہت دیر تک دروازے کے باہر کھڑی رہی۔ مگر کب تک آخر تنگ آ کر چلی آئی۔"

اس نے کھڑکی کا شیشہ اتار دیا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں سرد ہوا کے جھونکے پاگلوں کی طرح ناچ رہے تھے.... میں نے بلب کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ اس کی انگلیوں کی بالائی پوریں سفید پڑ گئی تھیں.... وہ سیٹ پر اچک کر بیٹھ گئی تھی.... میری انگلیاں اس کے گدر گدر بازو کو چھو رہی تھیں.... ریل کھاتاں اور ہارون آباد کا درمیانی فاصلہ طے کر رہی تھی اور ہارون آباد کی نزدیک آتی ہوئی روشنیاں بڑی پُر اسرار دکھلائی پڑ رہی تھیں، جیسے کسی خزاں زدہ جنگل میں کئی جگنو ٹمٹما رہے ہوں۔

وہ بالکل خاموش تھی۔ اس کے ہونٹ آپس میں بھنچ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر کو چڑھ گئی تھیں۔ اور پھر یوں ہوا کہ سرد ہوا کے جھونکے زور زور سے سرسرائے۔ جگنو ایک لحظے کے لئے ٹمٹمانا بھول گئے۔ فضا میں ایک ہولناک چیخ ابھر کر ڈوب گئی.... شاید نیند سے بوجھل آنکھوں والے مسافروں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا ہو۔

لیکن میں نے اس لڑکی کو محسوس کیا تھا.... میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ لڑکی احساس بن کر میرے سینے میں آج بھی دھڑکتی ہے ⁂

# گہری، گرم اور رحمدل ندیا

ہچکولے کھاتی ہوئی بس لکڑی کے بوسیدہ پُل کے قریب رک گئی۔ اور کنڈکٹر نے ندیا کے پار اس چھوٹے سے مٹیالے مکان کی طرف اشارہ کرکے سیٹی بجادی..... بس کا انجن گڑگڑایا۔ سائیلنسر میں سے سیاہ کثیف دھوئیں کا ایک غلیظ بادل نکلا اور ہوا میں کچھ دیر معلّق رہ کر تحلیل ہو گیا۔ ہلکی ہلکی گرد اڑاتی بس پہاڑیوں کے پیچ و خم میں غائب ہو گئی اور میں شام کے پھیلتے سایوں اور آسمان پر چنچل دوشیزاؤں کی طرح آنکھیں جھپکاتے ستاروں کے درمیان اکیلا رہ گیا۔

وادی میں حنائی چراغ روشن ہو گئے تھے۔ سانس لیتی ہوئی پہاڑی ندی میرے سامنے بڑے وقار کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ اور چاروں طرف ساون کے بادلوں ایسے سیاہ پہاڑ ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔

میں نے سگرٹ سلگایا اور دائیں ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھامے آہستہ آہستہ لکڑی کا بوسیدہ پُل عبور کرنے لگا۔ پُل کے کمزور تختے میرے قدموں کے نیچے بُری طرح چرچرائے اور سارا پُل ہنگھوڑے کی مانند جھولنے لگا۔ میں نے خوفزدہ ہوکر نیچے بہتے ہوئے گہرے سبز پانی کو دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا جلدی سے دوسری طرف اُتر گیا۔ گھبراہٹ میں میرا سگرٹ بھی انگلیوں سے چھُوٹ کر ندی میں گر گیا تھا۔ دن کا سمے ہوتا تو شاید میں جھولتے پُل سے اس قدر خوفزدہ نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت جب کہ چاروں طرف تاریکی چھا رہی تھی۔ ایک اجنبی مقام پر گہری ندی کا بوسیدہ پُل پار کرتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ کہ لہو اور گوشت کا یہ چھوٹا سا لوتھڑا سینے کی ہڈیاں توڑ کر باہر آ پڑے گا۔

پہاڑیوں میں گھرا ہوا وہ مٹیالا سا مکان جو پُل پار کرتے سمے نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ مجھے جلد ہی مل گیا۔۔۔۔ پُل کے اختتام سے اچانک شروع ہونے والی پگڈنڈی پر وہ پہلا مکان تھا۔ اور اگر بفرض محال میں بدحواسی میں اس مکان سے آگے بھی نکل جاتا تو زبیدہ مجھے آواز دے لیتی۔۔۔۔۔،

وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ جب اُس نے میٹھی آواز میں میرا نام پکارا تو میں لکڑی کے بوسیدہ پُل اور ندیا کے گہرے پانی سے

خوفزدہ ہو جانے پر اپنے کو ملامت کرنے لگا۔

وہ پورچ کی سیڑھیاں اُتر کر بھاگتی ہوئی مجھے پگڈنڈی پر ہی آن ملی۔

"تم پُل عبور کرتے سمے ڈر تو نہیں گئے تھے؟" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔

"ڈرتا نہیں تو اور کیا کرتا۔" میں نے کہا۔ "پل صراط ہے جو گزرنا تھا۔"

"پہلے پہل یہ پُل ہر ایک کو پلِ صراط ہی معلوم ہوتا ہے۔" وہ مسکراہٹ کی کلیاں چٹکاتے ہوئے کہنے لگی۔ "بعد میں مشق ہو جاتی ہے۔ پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے مداریوں کی طرح تنے ہوئے رستے پر چل رہے ہوں۔ اور کالج میں تو ہم دونوں تنے ہوئے رسّے پر چلنے کی باقاعدہ پریکٹس کیا کرتے تھے...... یاد ہے نا؟"

"ہاں یاد تو ہے۔ لیکن اتنی طویل مدّت گزر جانے کے بعد وہ مشق اب کہاں رہی۔" میں ہنس پڑا

ہم ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے آہستہ آہستہ پورچ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے ... زبیندہ میں کالج کی شوخی اب تک باقی تھی ...... وہ بار بار میرے بازو کے ساتھ جھول جاتی تھی۔ پورچ میں پہنچ کر اس نے گیلری کا دروازہ کھولا ...... اندر سے کوئی شمعدان لئے آرہا تھا ...... دھیمی دھیمی روشنی ماحول کو بے حد خواب آلود بنا رہی تھی....

ہم رُک گئے ..... روشنی نزدیک آتی گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد تیکھے تیکھے نقوش اور بارِ حیا سے جھکی ہوئی آنکھوں والی دو لڑکیاں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں شمع دان تھا اور دوسری نظریں جھکائے اپنی انگلیوں کو باہم اُلجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ میری منی بہن ہے، شمعی"۔ زبیندہ نے شمعدان والی لڑکی کی طرف اشارا کیا۔ "اور یہ دوسری غزالہ ہے"۔

میں نے دھندلکوں اور اُجالوں میں ان سے کچھ باتیں کیں اور پھر ہم ڈرائنگ روم میں چلے گئے..... وہاں اُن کے سپید بالوں والے پپا آتشدان کے سامنے بیٹھے۔ بے حد طمانیت کے ساتھ پائپ کے کش لگا رہے تھے.... .... دھوئیں کی مہک پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی .... میں نے پپا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"یہ میرے پپا ہیں" زبیندہ کو ایک بار پھر تعارف کی رسم ادا کرنی پڑی۔ "اُن کا خیال تھا کہ تم شاید تاریکی میں ہمارا مکان نہ تلاش کر سکو"۔

میں نے جھک کر پپا کو تعظیم دی .... انھوں نے اپنا باوقار چہرہ میری طرف موڑا اور پھر صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اگر زبیندہ مجھے نہ ٹوکتی تو میں لالٹین لے کر پُل پر آجاتا۔ لیکن یہ شریر لڑکی کہنے لگی کہ تم آسانی سے مکان ڈھونڈ لو گے"۔ ان کے لہجے میں شہد کی

مٹھاس اور محبت کا گہرا سکون تھا۔ "تمہیں کوئی دقت تو پیش نہیں آئی....
... میں اگر لالٹین لے کر پل پر چلا جاتا تو اچھا ہی تھا۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ مکان تو مجھے بھی کنڈیکٹر نے دور ہی سے دکھا دیا تھا۔ البتہ پل پر سے گذرتے ہوئے میرے حواس غائب ہو گئے تھے ..... اس بات پر وہ بہت ہنسے اور ایک پائپ میں تمباکو بھر کر مجھے آفر کرتے ہوئے بولے:

"لیکن اس قدر ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اوّل تو پل ہی نہ ٹوٹتا چونکہ یہ کئی برسوں سے ایسا ہی چلا آتا ہے۔ اور اب تک نہیں ٹوٹا۔ اور اگر تم، گاڈ فاربڈ، ندی میں گر ہی جاتے تو بھی گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس ندی میں لوگ گرتے تو رہتے ہیں لیکن آج تک ڈوبا کوئی بھی نہیں۔ اس کا پانی گہرا ہونے کے باوجود بے حد گرم اور رحم دل ہے ..... سرما میں بھی جب ہر طرف برف جم جاتی ہے تو اس کا پانی یوں ہی گرم رہتا ہے۔"

"نہیں پپا، یہ ندی میں نہیں گر سکتے تھے"۔ زبیندہ نے چپکے سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "جب یہ پل عبور کر رہے تھے تو میں پورچ کی سیڑھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ اگر ان کا کوئی قدم اوچھا پڑتا تو میں پکار کر انھیں بتا دیتی۔ یا بھاگ کر پل پر چلی جاتی۔"

پپا کے ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ کی روشنی پھیل گئی اور وہ ہولے ہولے زبیندہ کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے آتشدان کے سامنے بیٹھ گئے۔
"اچھا بھئی ان کو کمرہ دکھا دو" انھوں نے بجھا ہوا پائپ سلگاتے ہوئے کہا۔

زبیندہ پہلے ہی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ جو ڈرائنگ روم کے غربی گوشے سے بل کھاتی ہوئی اوپر چلی گئی تھیں ....... اس نے مسکرا کر مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ بل کھاتے ہوئے، پتلے پتلے زینے اوپر جا کر ایک چھوٹی سی تنگ گیلری میں ختم ہوتے تھے۔ جہاں صندل کی ایک بھاری گرد آلود میز پر نیچی بتی کا ایک لیمپ بڑے نامعلوم انداز میں جل رہا تھا۔
زبیندہ نے لیمپ اٹھا لیا اور میرے سامنے روشنی کرتی ہوئی چلنے لگی ..... گیلری عبور کر کے ہم ایک ہوادار، کشادہ کمرے میں داخل ہو گئے جس کے دریچے وادی کی طرف کھلتے تھے ..... دریچوں میں ستارے مسکرا رہے تھے ...... ہم چند لمحے خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے ... میں نے آگے بڑھ کر زبیندہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کے خوشبو دار گال چوم لئے۔
غسل خانے میں تازہ پانی ہے ..... یہ اس طرف کپڑے ٹانگنے کی

الماری ہے ..... صابن وغیرہ بھی میں نے رکھ دیا ہے کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

"نہیں زیبندہ" میں نے خواب آلود لہجے میں کہا۔ "مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی بہت ہے کہ تم میرے پاس ہو اور میں تمہارے مہک اُڑاتے بال چُھوم رہا ہوں ..... تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

اُس نے جلدی سے میری طرف دیکھا اور پھر اُس کی آنکھیں حیا کے بوجھ سے جُھک گئیں۔ ہم بہت دیر تک چُپ چاپ کھڑے رہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کریں ..... میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس وقت جبکہ وہ میرے قریب کھڑی ہے تو میں زندگی کا ہر غم بھول گیا ہوں۔ اور دل کا ہر داغ پھول بن کر مہک اٹھا ہے .... خواہ ایک رات کے لئے سہی، میں اپنے ترسے ہوئے دامن میں ستارے برستے دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکا .... میرے ہونٹوں پر تالے پڑ گئے تھے اور میری زبان خشک ہو گئی تھی۔

میں یہاں کیوں آیا ہوں ..... ؟ میں نے اپنے سے پوچھا۔

"میں یہاں لیمپ چھوڑے جاتی ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر پورچ میں آجانا میں وہیں ہوں گی۔ اچھا؟" زیبندہ نے دریچے میں فروزاں ایک ستارے

کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا وہ لیمپ تپائی پر رکھ کر چلی گئی۔ میں لیمپ لے کر غسل خانے میں چلا گیا...... منہ ہاتھ دھویا.... کپڑے بدلے..... بالوں میں کنگھی کی..... بیگ میں سے دُھلا ہوا رومال نکال کر جیب میں ڈالا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔

پورچ میں زبیدہ کے ساتھ اس کے پپّا بھی موجود تھے.... انھوں نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ زبیدہ اپنی کرسی گھسیٹتی ہوئی میرے قریب لے آئی اور اس کی انگلیاں میرے بازو کو چھونے لگیں۔

"تم ان پہاڑوں پر شاید پہلی بار آئے ہو؟" پپّا نے پوچھا

"جی ہاں، آج سے پہلے میں نے پہاڑوں کی شکل بھی نہ دیکھی تھی.... بڑا عجیب سا لگتا ہے یہاں آن کر۔ اور آپ شاید کبھی میدانی علاقے میں نہیں رہے؟"

"جس زمانے میں زبیدہ تمہارے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی، میں منٹگمری کے علاقے میں ایس۔ڈی۔او۔ ایری گیشن تھا۔ میں وہاں پورے تین سال رہا ہوں"۔

"ایس۔ڈی۔او۔ ایری گیشن ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کی زندگی کا غالب حصہ میدانی علاقوں میں ہی گذرا ہوگا"۔

عجیب بات تھی کہ زبیدہ میرے ساتھ کالج میں تین سال تک پڑھتی رہی تھی۔ کئی خوشگوار لمحے ہم نے اکٹھے گذارے تھے اور مجھے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ اس کے پپا کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ اس موضوع پر اس سے کبھی کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔

"میں نے اپنی زندگی کے بائیس سال میدانی علاقوں میں گذارے ہیں"۔ پپا کہہ رہے تھے۔ "لیکن ان پہاڑوں میں سیٹل ہونے کی تمنا ہمیشہ سے تھی"۔

میں پپا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میدانوں کے مقابلے میں انھیں پہاڑ کیوں پسند ہیں۔ لیکن وہ اور زبیدہ سوچ کی اَن دیکھی وادی میں اُتر گئے تھے ..... میں نے اس پُراسراری، درد بھری سی خاموشی کے درمیان بولنا مناسب نہ سمجھا۔

کچھ دیر کے بعد پپا کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ لیکن وہ نہ تو مجھ سے مخاطب تھے اور نہ زبیدہ سے۔ وہ کسی اور سے باتیں کر رہے تھے ... کوئی جو تھا وجود بھی وہاں اس تاریکی میں موجود تھا۔ جس کو کم از کم میری آنکھیں نہ دیکھ سکتی تھیں۔

زبیدہ نے اپنی کرسی اور نزدیک کھسکالی۔ اب میں اس کے گداز جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا اس کے بالوں کی خوشبو مجھے بے خود کئے دے رہی تھی۔ میں نے ہولے سے اس کا نرم صندلیں بازو چوم لیا۔ وہ مسکرا

اٹھی ..... نیچے وادی میں بڑے وقار سے بہتی ہوئی گہری ندیا کے رحم دل اور گرم پانی کا دھیما، دھیما شور فضا میں ترنم بکھیرتا رہا۔ اور میں اپنے جسم میں ہلکی ہلکی دل نواز سی گرمی محسوس کرتا رہا۔

"جب ان لڑکیوں کی ممی ہم سب کو چھوڑ کر موت کی وادی میں اتر گئیں۔" پپا نے بے حد موہوم آواز میں، آگے کو جھکتے ہوئے اور تاریکی میں ندیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو میں ان لڑکیوں کو لے کر باقی زندگی گذارنے ان پہاڑوں میں لوٹ آیا۔ ان کی موت کے بعد میدانی علاقوں میں رہنے کو جی نہیں مانتا تھا۔ صرف یہ پہاڑ ہی مجھے سکون بخش سکتے تھے۔ یہیں پر مجھے طمانیت ملی ..... شمعی اور غزالہ تو اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔ زبیدہ کو اپنی ممی یاد ہیں۔ یہ ان کے لئے اب بھی روتی ہے۔ لیکن ان کی بے وقت اچانک اور از حد دلگداز موت سے مجھ پر کیا کچھ گذر گئی۔ اس کا اندازہ شاید زبیدہ بھی نہیں کر سکتی۔ ان کی امی اور میں انھی پہاڑوں میں پیدا ہوئے تھے۔ یہیں ہم نے اپنے بچپن لڑکپن اور جوانی کے ہنستے مسکراتے دن گذارے اور یہیں موت نے انھیں ہم سب سے چھین لیا ..... ان دنوں میں رخصت پر تھا اور ہم یہاں، اپنے ان آبائی پہاڑوں میں رخصت کے دن گذارنے آئے تھے ..... وہ سوگوار، بوجھل بوجھل سا دن میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

جب ہلکی ہلکی بارش میں ہم نے انھیں قبر میں اتارا۔ یہ مکان لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا..... ساری وادی کے لوگ جمع تھے۔ بہرحال رخصت ختم ہونے پر میں ان بچیوں کو لے کر میدانی علاقوں میں چلا گیا اور زبینده کو پڑھنے لاہور بھیج دیا۔ میرا خیال تھا۔ کہ شاید اس طرح میں ان کو بھول سکوں گا۔ لیکن میں نے غلط سوچا تھا..... بالکل غلط سوچا تھا..... اپنے بچوں کی ماں کو کوئی کس طرح بھول سکتا ہے۔"

زبینده نے اپنے جسم کا سارا وزن مجھ پر ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس کے نم عارض میرے شانوں پر تھے۔ اس کی انگلیاں میرے بالوں میں ہولے ہولے کنگھی کر رہی تھیں۔ اور پاپا گہری تاریکی میں بدستور ندی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے اُن کی نگاہیں وہاں کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔ اُن کی آنکھیں ساکت تھیں اور ڈرائنگ روم کے ادھ کھُلے دروازے سے باہر آتی ہوئی مدھم مدھم روشنی ان کے چہرے پر زردیاں بکھیر رہی تھی۔ انھوں نے ایک لحظے کے لئے آنکھیں بند کیں اور دو موٹے موٹے آنسو ٹوٹتے ہوئے ستاروں کی طرح، ان کے گالوں پہ ڈھلک آئے اور پھیلی ہوئی سپید ہتھیلیوں پہ گر کر مٹتے مٹتے شعلوں کی مانند سلگتے رہے۔

معاً پاپا اٹھے اور خاموشی سے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ اُن کا سایہ اُن کے بعد بھی کتنی دیر تک پورچ میں لرزتا رہا۔ ڈرائنگ روم سے آتی

ہوئی ان کے بھاری بھاری قدموں کی چاپ موہوم ہوتی گئی۔ میں نے ادھ کھلے دروازے میں سے ان کو دیکھنے کی کوشش کی، مگر ہمت نہ پڑی۔

نیچے وادی میں ندیا کے کنارے، کسی بس کا ہارن گونجا۔ سکوت میں ایک لحظے کے لئے ہل چل پیدا ہو گئی۔ کچھ دیر کے لئے اندھیرے کو چیرتی ہوئی بس کی ہیڈ لائٹس دکھائی پڑیں۔ ندی کی سیال سطح پر اک ذرا روشنی کی قاشیں سیماب آسا تڑپیں اور پھر وہی سکوت ..... وہی خاموشی.... بس کی روشنیاں پہاڑوں کی اونچی اونچی کالی دیواروں کے عقب میں غائب ہو گئیں اور ندی کو پھر تاریکی کی غف چادر نے ڈھانپ لیا۔

زبیدہ کی انگلیوں کی گرفت میرے بازو پر سخت ہو گئی۔ اور اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا:

"ضیاء، خدا کے لئے بتاؤ تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو؟"

اس کی ملائم آواز نے ندی کی ہلکی ہلکی موسیقی میں گھل مل کر فضا میں نئے سپنے بکھیر دیئے۔

میرا خیال تھا کہ وہ چہرہ اٹھائے مجھے دیکھ رہی ہوگی۔ لیکن اس کی نظریں نیچے، نہ دکھائی دینے والی ندی کے گہرے گرم اور رحم دل پانی پر تیر رہی تھیں۔ اور اس کی آنکھوں میں اشکوں کے ننھے ننھے دیپک فروزاں تھے۔

میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ کہ میں اس سے ملنے کیوں آیا ہوں.....

شاید اس لئے کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ لیکن اب پپا کے ہونٹوں سے ان کی عظیم محبت کا تذکرہ سُن کر مجھے اپنی محبت حقیر محسوس ہو رہی تھی۔ محبت کے وہ دو سوگوار آنسو جو ان کی آنکھوں سے بہے۔ اس قدر بیکراں تھے کہ میری محبت کے سارے دریا اُن میں سما کر رہ گئے تھے..... مجھے معلوم تھا کہ اگر میں زبیدہ سے یہ کہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ تو وہ مان لے گی وہ اپنا سب کچھ مجھے دے دیگی..... اپنے جسم کا گداز اور اپنی روح کا نکھار سب کچھ بخش دے گی لیکن اس کے بدلے اس کو دینے کے لئے میں پپا کے بیکراں آنسو کہاں سے لاتا..... میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"تم کیوں آئے ہو ضیا"۔ اس نے پھر پوچھا۔

"کیوں آیا ہوں"؟۔

"ہاں، کیوں آئے ہو؟"

میری آنکھیں مند گئیں..... اور مجھے جھولتے پل، ندیا کے گہرے گرم اور رحم دل پانی اور وادی میں ایک ایک کر کے جل اٹھنے والے "حنائی" چراغوں کے علاوہ کچھ یاد نہ رہا۔

"بھئی، بتاؤ نا تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو؟"

"سچ پوچھتی ہو؟"

"ہوں"۔

"تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔"

"اگر تم بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے جتنی مجھے تم سے ہے تو شاید تمہیں معلوم ہوتا۔"

اس کی نازک نازک انگلیاں میرے ہاتھ میں کپکپائیں۔ مجھے معلوم تھا کہ زبیندہ مجھے چاہتی ہے۔ مجھے اس کا یقین تھا۔

"بہر حال میں نہ آتا تو اچھا تھا" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"تم صرف ایک رات کے لئے آئے ہو۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے تم چلے جاؤ گے ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تمہیں یہ افسوس نہیں کہ یہ وقت کم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت ہی کم۔"

"مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ میں کیوں آیا ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے یہاں آنے کا کوئی حق نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ جو لوگ محبت کرتے ہیں نا ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم ایک بار یہ کہہ دو کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ تو تمہارے جانے کے بعد بھی مجھے سکون حاصل رہے گا۔"

وہ میرے اور قریب آگئی ۔ ۔ ۔ میرا جسم کانپنے لگا ۔ ۔ ۔ اور پپا کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ، پاکیزہ فرشتوں کے روپ میں میرے سامنے ناچنے لگے۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ وادی کے چراغ گل ہو گئے تھے۔ اور ستاروں کی روشنی غبار بن کر اڑنے لگی تھی۔

اس کے نم ہونٹ میری گردن کو چھوتے رہے۔ اور اس کا سر میرے سینے پر لگا رہا۔۔۔۔ وہ میری تھی۔۔۔۔ زندگی کی آخری سرحدوں تک میری تھی ۔۔۔۔ لیکن اس سمے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ کہ میں اپنے کو اس کی محبت کا فیضان اٹھانے پر کبھی مجبور نہیں کر سکتا، جیسے میں کبھی اس طرح واپس نہیں جا سکتا کہ میرے دل میں یہ داغ ہو کہ میں نے اس سے اتنی محبت نہیں کی جتنی اس کو مجھ سے تھی۔

جب میں یہاں آ رہا تھا تو یہ باتیں، یہ احساسات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آئے تھے۔ میں نے تو اتنا طویل سفر صرف اس لئے طے کیا تھا کہ چند خوشگوار لمحے اس کے قرب میں بسر کر لوں گا۔ اور جب واپس آؤں گا تو زندگی کی اتھاہ مصروفیتوں میں ڈوب کر یہ بھول جاؤں گا کہ میں زبیدہ نام کی کسی لڑکی سے مل کر آیا ہوں۔۔۔۔ کتنی چھوٹی تھی میری محبت

جب ہم سونے کے لئے جانے لگے تو وہ حسب عادت میرے بازو کے ساتھ جھول گئی۔۔۔۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ اس کے دل کی تیز دھڑکن، حرارت کی لہر بن کر میرے سینے میں داخل ہونے لگی۔

پھر ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔۔۔۔ پپا شاید اپنی آنکھوں میں محبت کی عظمتیں لئے اپنے کمرے میں سو گئے تھے۔۔۔۔ ڈرائنگ روم خالی تھا۔۔۔۔ آتشدان میں آگ ہولے ہولے سلگ رہی تھی۔۔۔۔ زبیدہ

نے میز پر سے لیمپ اٹھالیا اور میرے آگے آگے زینہ چڑھنے لگی۔

میرے کمرے کے سامنے آکر وہ رُک گئی۔ اور لیمپ مجھے تھما دیا۔

"شب بخیر زبیدہ"۔

"شب بخیر، میں تمہیں چار بجے جگادوں گی۔ تمہاری بس شاید ساڑھے چار کے قریب گذرے گی۔"

"ہاں ذرا جھنجوڑ کر جگادینا۔ میری نیند بہت گہری ہے"۔

"کوئی فکر نہ کرو تمہاری بس نہیں چھوٹے گی۔" وہ ہنس پڑی۔

اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ اور چلی گئی۔ میں نے کپڑے بدلے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کوسوں دُور تھی۔ مجھے معلوم تھا۔ کہ آج کی رات آنکھوں میں ہی کٹے گی۔ میں تکیوں کا سہارا لے کر اُٹھ بیٹھا اور سگرٹ سُلگالیا.... سگرٹ سلگتے رہے.... خوشبودار نیلا دھواں کمرے میں ناچتا رہا۔ کھلے دریچوں میں سے ہوا کے سرد جھونکے اندر آتے رہے آوارہ لمحے سرسراتے ہوئے گذرتے رہے۔ اور میں جاگتا رہا.... مکان بالکل خاموش تھا.... کبھی کبھی زبیدہ کے کمرے میں سے آتی ہوئی قدموں کی اُلجھی اُلجھی دھیمی چاپ سُنائی دے جاتی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے۔ یہ سب کچھ میرا وہم تھا۔ زبیدہ آرام سے پڑی سو رہی ہو گی۔ مجھے نہیں معلوم میں کب تک اسی طرح بستر پر بیٹھا سگرٹ پر سگرٹ

پھونکتا رہا پھر یکایک مجھے نہ جانے کیا ہوُا کہ میں اُٹھا اور ہولے سے دروازہ کھول کر گیلری میں سے ہوتا ہوُا زبیندہ کے کمرے کے سامنے آ گیا۔ اس کا دروازہ آدھا کھُلا تھا۔ اور پیلی روشنی کی موٹی سی لکیر باہر نکل کر بالکونی کے جنگلے سے لپٹ رہی تھی۔ میں اس درز میں سے زبیندہ کو صاف دیکھ سکتا تھا، اس کا لیمپ روشن تھا۔ اس نے اپنا چہرہ تکیوں میں چھُپایا ہوُا اور اس کا پورا جسم سسکیوں سے لرز رہا تھا۔ اس کے بال شانوں پر پریشان تھے۔ اس کی ریشمی نائٹ گاؤن برف کی ایسی سپید تھی۔ وہ اس سمے کسی دُور دراز جزیرے کی اپسرا دکھلائی پڑ رہی تھی۔ جو ہجر کی تلخیاں سہہ رہی ہو۔ اندھیری رات کی کہکشاں جو چاند کی جدائی میں ستاروں کے آنسو بہا رہی ہو...... اس کے حُسن کا یہ سوگوار پہلو اب تک میری نگاہوں سے اوجھل رہا تھا...... اس سمے میں اس کو ایک نئے روپ میں دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی اور اس کے ہاتھ دُعا کے انداز میں اٹھ گئے .... سسکیوں اور آہوں کے درمیان مانگی گئی اس دعا کو کون خدا رد کر سکتا ہے؟ میں نے سوچا.... تب مجھے معلوم ہوُا کہ میں زبیندہ سے محبت کرتا ہوں.... وہی محبت جو بیرا نے اپنے بچوّں کی ممی سے کی تھی۔

میں چپکے سے واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور دریچے کے سامنے بیٹھا صبح کا انتظار کرنے لگا..... میں نے گہری گرم اور رحم دل ندیا کی

دلنواز موسیقی اپنے دل میں دھڑکتی محسوس کی۔۔۔۔ میں کمرے میں بیٹھا بیٹھا ندیا کے قریب چلا گیا تھا۔ اتنا قریب کہ مجھے یوں لگتا جیسے میری انگلیاں اس کی سیال سطح کو چھو رہی ہوں۔

صبح نزدیک آتی گئی۔۔۔۔ اور گئی رات مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے دروازے کے قریب آ کر لوٹ گیا ہو۔۔۔۔ گذراں شب کے جاگتے لمحوں کی قسم۔ میں نے اپنے کمرے کے دروازے کے عقب میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنی تھی۔

اور جب دودھ کی طرح کنواری وہ صبح پربت پربت پھیل گئی تو دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہوئی۔۔۔۔ میں نے سنا کہ زبیندہ میرا نام لے کر مجھے ہولے ہولے پکار رہی تھی۔

میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔۔۔۔۔۔ وہ ناشتے کی ٹرے لیے کھڑی تھی۔

"زبیندہ" میں نے کہا۔ "اتنی جلدی کی کیا ضرورت تھی۔"

"کیوں تمہیں جانا نہیں ہے؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، میں اب جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"کیا مطلب؟" اُس نے مطلب سمجھتے ہوئے شرارت سے آنکھیں جھپکائیں۔

مطلب پھر بتاؤں گا۔ فی الحال تم مجھے ندیا پر لے چلو۔ میں اس کے گہرے گرم اور رحم دل پانی کو اپنی انگلیوں سے چھونا چاہتا ہوں۔"
زینبہ کے عارضوں پر حیا کے گلاب کھل اُٹھے اور ہم ہاتھ میں ہاتھ دیئے گہری، گرم اور رحمدل ندیا کی طرف جا رہے تھے ؛

# اِک جذبۂ شعلہ نما

(۱)

گذشتہ موسم سرما کی ایک چمکیلی صبح کو جب میں نے اُسے ہارڈن آباد کی غلّہ منڈی کی چوڑی چکلی سڑک پر سر نیہوڑائے چلتے دیکھا تو مجھے کچھ تعجب بھی ہُوا اور کچھ اس کی طرف ایک عجیب انس آمیز کشش بھی محسوس ہوئی۔

وہ کافی عرصے سے ہم دوستوں کے نزدیک دیومالائی شخصیت، ہلکے پھلکے مذاحیہ فقروں کا نشانہ، اور رسمی سی ہمدردی کے قابل ایک یتیم سی مخلوق بن کر رہ گیا تھا۔ اِدھر اُدھر ڈولتا ہُوا ایک تنہا آوارہ، بے مصرف سا وجود۔ جس کو شاید اس کائنات سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور جو اپنے غیر محسوس سے وقار کے باوجود وقت سے پہلے گنوار پنے کی حد تک بے تکا اور بے ڈھنگا ہو گیا تھا: ہاں وہ، جو اپنی وضع کا سختی سے پابند اور اپنے تعلقات میں از حد محتاط تھا۔

ہم دوستوں کے مابین یہ ایک "بین الاقوامی" طور پر طے شدہ امر تھا، کہ محسن راؤ اس لڑائی کا پہلا شکار ہے جو اس کے باپ اور جگت چچا راؤ معین الدین احمد نے اُس کو ڈھال بنا کر اپنی جاہل لیکن سنجیدہ بیوی سے لڑی تھی۔ راؤ معین الدین احمد، جنھیں ہم سب چچا معین کہتے تھے، اپنے بے پناہ ڈیل ڈول اور پہلوانہ ذوق کے ساتھ ہمیشہ مسرت کی تلاش میں رہتے تھے۔ مسرت کی تلاش ان کی زندگی اور مسرّت کا حصول ان کا واحد نصب العین تھا۔ اور بفضلِ خدا قسمت انھیں اپنی چندیا سے بھی زیادہ تابناک ملی تھی۔

بہر حال مجھے وہ زمانہ اب بھی یاد ہے، جب محسن راؤ اپنی وضع کا اس قدر سختی سے پابند نہ تھا۔ جب اس کے طور طریقوں میں وقار کے باوجود ایک خوشبودار ملائمت ہوتی تھی۔ اس کے وہ تیز تیز فقرے آج بھی میرے ذہن میں گونج رہے ہیں، جو ہماری محفلوں کا حاصل ہوا کرتے تھے۔ اور اُس زمانے میں ہی نہیں بلکہ اس سے بھی پہلے اور دوستوں کے نہیں تو کم از کم میرے اور اس کے روابط نہ صرف بے تکلفانہ اور دوستانہ بلکہ باوقار، سنجیدہ اور بزرگانہ بھی تھے۔ میں کبھی کبھی معاً اپنے کو اس کے سامنے بچّہ سمجھنے لگتا تھا۔ وہ اکثر اوقات بڑی بزرگی کے ساتھ مجھ پر تنقید کرتا تھا۔ لیکن اگر وہ میرا بزرگ تھا تو اس سے زیادہ ایک سچّا اور مخلص دوست بھی تھا۔ اس کا بزرگانہ رویّہ اس کے شخصی وقار کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور یہ وقار

اس کے وجود کی سالمیت کی دلیل تھا۔

میں نے اسے آواز دی۔ اس نے پیچھے مڑکر دیکھا اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ ہم برسوں پہلے کے معمول کے مطابق صابری ہوٹل میں چلے گئے۔ میں پھر اپنے کو اس کے سامنے بچہ محسوس کرنے لگا۔ میں نے چائے منگوائی اور ہم ہولے ہولے چائے پینے لگے۔ دُبلے پتلے جسم، لمبے قد، چھوٹے چھوٹے خشک ہونٹوں اور طوطے ایسی ناک والا محسن راؤ جو اس سمے گہرے سیاہ رنگ کے ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا اور چائے پیتے ہوئے اپنے اڑتے اڑتے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا، کتنا بدلا بدلا دکھلائی پڑ رہا تھا۔ یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کی عمر ستائیس برس ہے۔ وہ اپنی عمر سے منزلوں آگے نکل گیا تھا۔

"اچھا تو تم ہارون آباد میں ہی ہو"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور ایک ناول لکھ رہے ہو۔ ہیں؟"۔

"ہاں"۔ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"یار بڑا اچھا ہوا کہ تم مجھے مل گئے۔ ورنہ آجکل تو والد صاحب کے سوا ملنا تو درکنار کوئی میری پرواہ ہی نہیں کرتا۔ اور ابا شاید اپنی مردانگی کے آخری ثبوت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔ ورنہ شاید وہ بھی ...." وہ بڑے جُھجتے ہوئے انداز میں مسکرایا۔ "اچھا خیر چھوڑو۔ اور کوئی نئی تازی

سُناؤ۔۔۔ میں تو پتہ نہیں کتنی صدیوں کے بعد ہارون آباد آیا ہوں" وہ اپنے مستحکم لہجے میں کہتا رہا۔۔۔ "اپنے دوستوں کا کیا حال ہے؟

میں نے اسے بتایا کہ میں آج کل ناول لکھنے کے علاوہ ایک قتل کے مقدمے میں بھی پھنسا ہوا ہوں۔ مختار نے آٹھ برس کی لگاتار کوشش کے بعد ادیب فاضل کر لیا ہے۔ اس نے لکھنا لکھانا چھوڑ دیا ہے، اور مہاجر کالونی کے مڈل اسکول میں نوکری کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کو دوسری بار حاملہ کرنے کی سوچتا ہے۔ مرتضیٰ نے بہاول پور کے انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھائی کے نام پر نئے فیشن کے سوٹ پہننے اور ہڑتالوں میں حصّہ لینے کی مشق شروع کر رکھی ہے۔ تاثیر بھی بہاولپور میں ہی ٹریننگ کالج میں لیکچرار ہے اور مہگل و دلبر کے کیس پر پُر جوش نظمیں لکھنے کے علاوہ پرائیویٹ ٹیوشنیں بھی کرتا ہے۔ سُنا ہے کہ ایک لڑکی پر جس کو وہ ٹیوشن پڑھاتا تھا، یونہی چند دنوں کے لئے چپکے چپکے عاشق ہو گیا تھا۔ اور دوسری شادی کے مسئلے پر سوچتا رہا۔ ہارون آباد میں لے دے کے رشید قلعی کر رہ گیا ہے جو ہر ہفتے لاکالج میں داخلہ لینے لاہور جاتا ہے لیکن سمہ سٹہ سے واپس آجاتا ہے۔ محسن راؤ ان معلومات پر دل کھول کر ہنستا رہا۔ اس کے چہرے پر ماضی کی چمک پھیل گئی۔ ان معلومات کے سہارے اُس نے اپنے حال کا رشتہ ماضی سے جوڑ لیا تھا۔ ماضی جو اب بھی اس کے خیالوں کا محور تھا، مُسے گذرے

دِنوں کی ایک ایک بات یاد تھی۔ بیتے لمحوں کا رقص ختم ہو گیا تھا، لیکن اس رقص کا ایک ایک زاویہ یادوں کے روپ میں اس کے ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ تھا۔ ماضی کا بلّور کرچی کرچی ہو کر بکھر چکا تھا۔ لیکن اُس نے یہ ساری کرچیاں جمع کر لی تھیں۔ جانو اسے پہلے سے پتہ تھا کہ مستقبل کے بیکراں، تنہا، خاموش اندھیروں میں صرف اِنہی کرچیوں کی جھمک، تھوڑی بہت روشنی بکھیر سکے گی۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ سے ملنے۔ مجھ سے باتیں کرنے کے بعد اس نے ماضی کا وہ بلّور صحیح سالم شکل میں دیکھ لیا ہو گا۔ جس نے ٹوٹ پھوٹ کر ان کرچیوں کو جنم دیا تھا۔ بلّور — جس کے بارے میں اُسے شبہ ہو چلا تھا کہ یہ کبھی صحیح سالم شکل میں بھی موجود رہا ہو گا۔

اس کے بعد وہ دو ایک بار میرے گاؤں آیا۔ ہم نے کئی دفعہ رات کا کھانا بھی اکٹھے کھایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں ہارون آباد میں چند ہفتے گذارنا چاہتا ہوں۔ اور میں نے پنجاب ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ اکثر چُپ چُپ کھویا کھویا رہتا تھا۔ وہ ہارون آباد میں میرے سوا کسی پُرانے دوست سے نہ ملا۔ اور نہ ہی اس نے نئے دوست بنانے کی کوشش کی۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ انجمن آرائی کے بغیر ہم اُس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور آج وہ اتنا مردم بیزار ہو گیا تھا کہ نہ صرف لوگوں کی شکلوں سے بلکہ اُن کی آوازوں سے بھی گھبراتا تھا۔

ہارون آباد سے اُسے محبت تھی۔ اپنی کئی نظموں میں اس نے ہارون آباد کا یوں ذکر کیا تھا کہ ہم اس شہر کو اس کی محبوبہ کہنے لگے تھے۔ اور اب اگرچہ وہ زبان سے تو نہ کہتا تھا، لیکن چاہتا یہی تھا کہ ہارون میں کوئی متنفّس نہ رہے۔ یہاں کی کھڑکیاں گداز چہروں سے خالی ہو جائیں، یہاں کی سڑکوں پر ویرانی پھیل جائے یہاں کے مکان سُنسان ہو جائیں۔ اور یہاں اُس کے سوا کسی کی آواز سُنائی نہ دے۔ وہ کہتا تھا کہ ہارون آباد کی آبادی چار طبقوں پر مشتمل ہے۔ زمیندار، آڑھتی، ملازم پیشہ اور ادیب و شاعر۔ اور اب یہ چاروں طبقے اس کے نزدیک ناپسندیدہ تھے۔

"یار، پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔" ایک دن پنجاب ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ "آج کل زمینداروں کو دیکھتا ہوں تو ذہن میں ٹریکٹر گڑگڑانے لگتے ہیں۔ کسی آڑھتی پہ نظر پڑ جاتی ہے تو آٹے دال کا بھاؤ یاد آ جاتا ہے۔ کوئی ملازم پیشہ دکھلائی پڑ جاتا ہے تو دل و دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگتے ہیں۔ یہاں کے کسی ادیب یا شاعر کو دیکھ لیتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روشنی، حرارت اور محبت کی اس سرزمین پر کوئی بھکاری گھوم رہا ہو۔" اور وہ خود؟ وُہ محسن راوؔ ؟ ۔ ارے وہ تو تنہا رہنے اور ہارون آباد کے سُنسان شہر کے حسن پہ نظمیں لکھنے یہاں آیا تھا۔ آخر اس نے یہاں کی رونقوں پہ بھی تو

نظمیں لکھی تھیں۔ اب وہ یہاں کی ویرانیوں پر نظمیں لکھنا چاہتا ہے۔ پھر ہارون آباد ویران کیوں نہیں ہو جاتا۔؟۔ ویرانی میں بھی تو حُسن ہوتا ہے۔

ایک دن میں اپنے گاؤں سے ہارون آباد گیا تو وہ مجھے ریلوے لائن کے پھاٹک پر ہی مل گیا۔ حالانکہ وہ بہت کم اپنے ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلتا تھا۔ وہ کچھ بولایا بولایا اور پریشان سا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وُہ لپک کر میرے پاس آ گیا۔ جیسے کافی دیر سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

"یار! تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے"۔ اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ہم پنجاب ہوٹل آ گئے۔ وہ حسب معمول مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور سگریٹ سلگا کر کہنے لگا۔

"کراچی سے ابّا جی کا خط آیا ہے۔ وہ اس مہینے کے آخر میں سالانہ میلہ مویشیاں کے موقع پر دنگل دیکھنے یہاں آ رہے ہیں"۔

"تو کیا ہوا۔ اچھا ہے ۔۔۔ اُن سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ جب سے ہارون آباد چھوڑا ہے بچا نے پلٹ کر شکل ہی نہیں دکھائی"۔

میرے اس جواب پر وہ خاصا چیں بجبیں ہوا۔

"لیکن میں یہ کہتا ہوں یار! کہ اتنا لمبا سفر محض ایک دنگل دیکھنے کے لئے کرنا آخر کہاں کی تُک ہے۔ اِس عمر میں تو لوگ حج کی تیاریاں کرتے

ہیں اور انھیں دنگل کی سوجھ رہی ہے۔"

"پر محسن! میں تو دعا کرتا ہوں کہ جب میری عمر اڑسٹھ برس کی ہو۔ تو خدا مجھے بھی چچا معین کی طرح زندہ دل رکھے کہ حج کی بجائے میلوں کے دنگل دیکھنے کے لئے لمبے سفر کیا کروں۔"

"ان کی عمر تو اب ستّر برس کی ہے یار۔!" اس نے خشک لہجے میں تصیح کی۔ "اور تم یہ بھول رہے ہو ذکا! کہ ابّا جی ایسے آدمیوں کو ہمیشہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ میری مراد روپے پیسے والی قیمت نہیں۔ ابا جی نے دُنیا میں روپیہ پیسہ تو کافی سے زیادہ پایا ہے۔ میرا مطلب ہے جذبات کی قیمت۔ وہ اپنی خوشی کے آگے کسی کی پروا نہیں کرتے۔ جہاں اپنی مسرت کا سوال ہو وہ اوروں کے لئے بے درد بن جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا جیسے کسی ذہنی اذیت سے گذر رہا ہو۔

میں نے اس ناگوار خاموشی کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم یوں کیوں نہیں سوچتے کہ وہ تم سے ملنے آ رہے ہیں۔ وہ تم سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ تمہیں چند مہینوں کے لئے بھی اپنے سے جُدا نہیں رکھ سکتے۔"

اس کے چھوٹے چھوٹے خشک ہونٹوں پر ایک زہرناک مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میلہ مویشیاں اور دنگل مجھ سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ شاید اُن کے آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو جو تم نے بنائی ہے۔ لیکن کیا میلہ مویشیاں کے موقع پر ہی آنا ضروری تھا۔ تاکہ اپنے ساتھ مجھے بھی اس بے تکے شور و غل میں لئے پھریں۔ پہلوانوں کے نغل ٹھل کرتے جسم دکھا کر میرے سر میں درد کریں۔ اب وہ آئیں گے تو یہی کہیں گے کہ چلو میرے ساتھ دنگل ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں شور و غوغا سے کتنا گھبراتا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ چچا معین تمہیں پریشان کرنے آ رہے ہیں؟۔ یہ تمہاری بڑی زیادتی ہے محسن!۔"

"ارے تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ صرف مجھے پریشان کرنے آ رہے ہیں۔ لیکن میری پریشانی کی ایک وجہ ضرور بن جائیں گے۔ خواہ غیر شعوری طور پر سہی۔"

اس پر میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

"اپنے والد کے متعلق کیا تم یہ سب کچھ دیانت داری سے سوچ رہے ہو؟"

اس سوال کا جواب اس نے کافی دیر سوچنے کے بعد دیا۔

"دراصل بات یہ ہے ذکا! کہ ابّا جی اور میں قطعاً مختلف ذہنیتوں اور طبیعتوں کے مالک ہیں۔" اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا "اور ہم دونوں

یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک، یہ بھی خوب جانتا ہے کہ ہم دونوں کے لئے اپنی اپنی وضع کا بدلنا ممکن نہیں۔ اب تک ہم باہمی نباہ کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈتے رہے ہیں۔ اگر کبھی کوئی راستہ نہیں ملا تو ہم کسی موہوم سی لکیر کو راستہ فرض کر کے اس پہ چلتے رہے ہیں۔ بہر حال ——" وہ خشک اور ازحد منطقی انداز میں کہتا رہا —— "جب تک ہارون آباد میں میلہ مویشیاں جاری رہے گا میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں فقیر والی چلا جاؤں گا اور وہاں مدرسہ عربیہ قاسم العلوم کی لائبریری میں پرانی کتابوں کے نسخے دیکھوں گا۔"

"تو تم اپنے ابا سے بھی نہیں ملو گے؟"

"نہیں۔ ویسے اگر وہ مجھ سے ملنا چاہیں گے تو خود ہی فقیر والی آجائیں گے سنا ہے مدرسہ عربیہ قاسم العلوم کی لائبریری میں نایاب کتابیں ہیں۔ اچھا وقت گزر جائے گا۔ چلو گے؟"۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے اپنا ناول جلد مکمل کرنا ہے اور مقدمے کی تاریخیں بھی نزدیک آرہی ہیں۔ اس لئے مجھے ہارون آباد میں ہی ٹھہرنا ہو گا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ تم میلہ مویشیاں بھی دیکھو گے۔ ہیں نا ——؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں اگر فرصت ہوئی تو ضرور دیکھوں گا۔"

"ہوں"۔ اس نے بڑے افسردہ انداز میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں میلہ دیکھنے سے منع نہیں کرتا۔ لیکن اس بات پر ضرور حیران ہوں کہ ایک فنکار نایاب کتابوں کی رفاقت پر میلوں کے ہڑبونگ کو کیسے ترجیح دے سکتا ہے تم نے میری دعوت سے انکار کر دیا ہے تب مجھے بہت دکھ ہوا ہے ذکا! کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں "ایک جذبۂ شعلہ نما" میں جل رہا ہوں!"

واقعہ یہ ہے کہ اس نے مجھے بتایا تھا۔ ایک رات جب وہ گارڈن میں میرے ساتھ کھانا کھا رہا تھا تو اس نے بڑی دکھی آواز میں کہا تھا: "ان دنوں لوگ میری طبیعت کا صرف وہ پہلو دیکھتے ہیں کہ جس میں میرا وجود اپنی وضع کا سختی سے پابند، اپنے تعلقات میں از حد محتاط اور مردم بیزار نظر آتا ہے۔ ان کو وہ محسن راوی دکھائی نہیں دیتا جو ایک محبت کرنے والا، خوابوں کے نازک محلوں میں بسنے والا، مخلص اور سچا انسان ہے"۔

آج جب اس نے یہ کہا تھا کہ میں "ایک جذبۂ شعلہ نما" میں جل رہا ہوں تو شاید اس کا یہی مطلب تھا۔ لیکن میں نے اس کے خشک چھوٹے چھوٹے لبوں پر پھیلی ہوئی ایک مقہور مسکراہٹ کو دیکھ کر سوچا۔ کہ اس کے ذہن کے اندر سلگتا ہوا وہ ایک جذبۂ شعلہ نما کیا بجھ نہیں گیا؟۔ اگر بجھا نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہے کہ بڑے غیر محسوس انداز میں جل رہا ہے۔ جیسے چراغ تہہ داماں۔

"بہر حال اس دنیا میں کئی انسان وہ بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جنہیں ایک

جذبۂ شعلہ نما میں جلنے کی بجائے اور بہت سے اہم کام در پیش ہیں"۔ میری اس بات پر وہ بُری طرح جھنجھلا گیا۔۔۔ وہ کوئی سخت سا جواب دینے والا تھا کہ معاً میری نظر رشید قلعی گر پہ پڑ گئی۔ وہ کمرے کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ شاید چائے پی کر واپس جا رہا تھا۔

"ارے رشید قلعی گر"۔ میں نے بے ساختہ کہا۔

محسن راؤ نے بھی چونک کر اپنی نظریں اٹھائیں۔ اور رشید قلعی گر کی طرف دیکھا۔

"اگر کہو تو بُلا لوں اسے۔ ذرا گپ شپ رہے گی"۔ میں نے محسن سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں ضرور"۔ اس نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے تو ایک کام سے مہاجر کالونی جانا ہے۔ تم اسے بلا کر کہیں لے جاؤ۔ مَیں اتنے میں وہاں سے ہو آؤں"۔

"عجیب چغد ہو یار!"۔ محسن کی اس حرکت پر میں جھنجھلا گیا۔ "وہ آئے گا، اور تم اٹھ کر چل دو گے۔ ایسی بھی مردم بیزاری کیا کہ پُرانے دوستوں سے ملنا بھی ناگوار ہو"۔

یہ کہہ کر میں نے جلدی سے کمرے سے باہر نکل کر رشید قلعی گر کو آواز دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر مسکراتا ہوا کمرے کی طرف آ گیا۔ اُس کی زندہ اور شاداب مسکراہٹ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے رشید قلعی گر مجسم زندگی ہے۔ ایک ہنستی مسکراتی، اچھلتی کودتی زندگی۔ اور محسن راؤ۔۔۔؟

انسان کے جامے میں موت۔ ایک منجمد خشک، ویران موت۔

"رشید"۔۔۔ اس کے نزدیک آنے پر میں نے کہا۔ "آؤ تمہیں محسن سے ملاؤں۔ معلوم ہے تمہیں کہ وہ آج کل ہارون آباد آیا ہوا ہے۔۔؟"

"محسن"۔۔۔ حیرت اور خوشی سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ہاں محسن!۔۔۔ اگر تم اسے پہچان سکو۔"

"خیر، ناقابلِ شناخت حالت تو اس کی ہارون آباد چھوڑنے سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ لیکن اب وہ دوبارہ یہاں کیسے آگیا۔۔؟"

"تم آؤ تو سہی۔"

ہم کمرے میں آگئے۔ محسن کو دیکھ کر رشید قلعی گر اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ لیکن محسن نے کسی خاص گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔

زندگی، موت سے گلے مل کر روتی رہی۔

رشید قلعی گر عمر میں مجھ سے بڑا اور محسن راؤ کے برابر تھا۔ متناسب جسم، لمبے قد، خوبصورت بالوں اور سیاہ آنکھوں والے اس خوش باش لڑکے کی کسی زمانے میں محسن راؤ سے خوب گھٹتی تھی۔

اس کا جسم متناسب ہونے کے باوجود کچھ کمزور سا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت حیا ناچتی تھی۔ اور رخساروں پر ایک دوشیزہ شگفتگی

اور شادابی کا عکس تھا۔ حالانکہ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اور لوگ کہتے تھے کہ اس کی بیوی بڑی پیاری لڑکی ہے۔۔۔ لیکن رشید قلعی گر اپنی بیوی سے مطمئن نہ تھا۔ کہتا تھا کہ بہت ننک چڑھی ہے۔۔۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اگر اس کا شوہر رشید قلعی گر کی بجائے کوئی اور ہوتا تو شاید وہ ننک چڑھی نہ ہوتی۔ ہر لڑکی کی طرح اس کی بھی تمنا ہو گی کہ ایک چھوٹا سا اپنا گھر ہو۔ پیارے پیارے بچے ہوں۔ آنگن میں گلاب کے پودے ہوں۔۔۔ بندھی ٹکی آمدنی ہو۔۔۔ شوہر کی گرم آغوش ہو۔ اور ہر طرف سکون ہی سکون ہو۔ شانتی ہی شانتی ہو۔ لیکن رشید قلعی گر کے لئے یہ سب کچھ ممکن نہ تھا۔ وہ ایک سیمابی طبیعت کا مالک، اور لاابالی سا لڑکا تھا۔ سینکڑوں دفعہ پروگرام بنانے کے باوجود وہ وکیل بننے کے لئے اب تک لاء کالج میں داخلہ نہ لے سکا تھا۔ چند حدود کی پابند ایک باقاعدہ زندگی گزارنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ وہ کئی کئی راتیں بیوی کے پاس سونے کی بجائے دوستوں کے ہاں گذار دیتا تھا۔ اس کے ہر قسم کے دوست تھے۔ شریف۔ بدمعاش۔ پڑھے لکھے۔ جاہل۔ دوستی کے لئے بھی وہ کسی معیار کی پابندی نہ کرتا تھا۔ جو ایک دفعہ اس سے ہنس کر بول لیا وہ اس کا دوست۔ اور جس نے ایک دفعہ رشید صاحب کہہ کر پکار لیا وہ اس کا یار۔۔۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی میں ڈرامہ پیدا کئے رکھتا تھا۔۔۔ اور جب اُکتا جاتا تھا تو اپنی

بیوی کے پاس چلا جاتا تھا۔ وہ بیچاری معصوم سی، پیاری سی لڑکی اس سے باتیں کرنا چاہتی لیکن یہ اپنی زندگی کے ہنگاموں سے تھکا ماندہ چپ چاپ آنکھیں بند کئے بستر پر لیٹا رہتا ــــ وہ اسے رجھانا چاہتی تو یہ کروٹ بدل لیتا۔ یا پھر بقولِ خود دو چار چُمیاں لے کر سو جاتا۔ وہ جھنجلا کر لڑنے جھگڑنے لگتی تو اگلے دن اسے میکے روانہ کر دیتا۔ چنانچہ آج کل بھی وہ میکے گئی ہوئی تھی اور رشید مکمل طور پر آزاد تھا۔ اور اِدھر اُدھر آوارہ گردی کے علاوہ غزلوں پر غزلیں کہہ رہا تھا۔ اور فلمی رسالوں کے لئے کہانیاں لکھ رہا تھا ــــ باپ نے خرچ وغیرہ دینا بند کر دیا تھا۔ اور ان کہانیوں کے تھوڑے بہت معاوضے پر ہی اس کی گزر اوقات تھی۔ اب وہ پنجاب ہوٹل کے اس کمرے میں بیٹھا مجھے اور محسن کو بتا رہا تھا کہ ان دنوں پیسے وغیرہ بالکل ختم ہو گئے ہیں اور وہ اپنی بیوی کو میکے سے واپس لانے کی سوچ رہا ہے۔ تاکہ اس کے کچھ گہنے بیچ کر اس اقتصادی بحران پر قابو پایا جائے۔

"لیکن میں ایسی باتوں کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا"۔ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "یہ میرے لئے روزمرّہ کی بات ہے۔ بیوی کے گہنے محض چاٹنے کے لئے نہیں رکھے جاتے بلکہ یہ ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ وقت پڑنے پر ان سے ضرورت پوری کی جائے۔ میں تمہاری طرح غلط قسم کا جذباتی

انسان نہیں ہوں، سمجھے پیارے ذکا الرحمٰن! تم تو بجلی کے کھمبے سے بھی جذباتی ہو جاتے ہو۔" معاً اس نے محسن راؤ کو اپنا مخاطب بنا لیا۔ "یار محسن! یہ ذکا مہا قسم کا بور ڈوا ہے۔ اتنا بور ڈوا میں نے دنیا میں کوئی نہیں دیکھا۔ دراصل مولوی مختار کے ساتھ رہ کر یہ بھی مولوی بن گیا ہے۔"

میں نے ایک نظر چرا کر محسن راؤ کی طرف دیکھا۔ میں حیران تھا کہ اب وہ اُکتایا اُکتایا دکھلائی نہیں پڑ رہا تھا۔

"یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو رشید۔" محسن نے تائید کی۔ "ذکا واقعی رجعت پسند ہو گیا ہے۔ فیض کو پسند کرتے کرتے ایک دم جگر مراد آبادی کو پسند کرنے لگنا۔ اور اتنی وسیع دنیا کو چھوڑ کر محض ہاردن آباد کی کہانیاں لکھنا ریٹریٹ (Retreat) نہیں تو اور کیا ہے۔"

محسن راؤ کی اس غیر متوقع تائید پر میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

"اور میری اس رجعت پسندی کی وجہ شاید یہ ہے کہ۔" میں نے جوابی حملہ کیا۔ "میں ایک شعلہ نما جذبے میں نہیں جلتا۔ تمہارا کیا حال ہے رشید۔ یہ شعلہ نما جذبہ تمہارے اندر بھی سُلگتا ہے یا نہیں؟"

میری اس چوٹ پر محسن راؤ کے چہرے پر سُرخی پھیل گئی ---- اور یہ سرخی رشید قلعی گر نے بھی دیکھ لی۔

"میں ---؟" رشید نے جلدی سے پینترا بدلا۔ "ہاں میں بھی اس شعلہ نما

جذبے میں جلتا ہوں۔ اور شرط لگا لو کہ محسن بھی اس شعلہ نما جذبے میں جلتا ہے
ہر سچا فن کار اس شعلہ نما جذبے میں جلتا ہے" اس نے اپنا منہ محسن کی طرف
موڑ لیا۔" اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ذکا اس جذبے کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ میں
ذکا کو فن کار نہیں مانتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک داستان گو ثابت ہو سکتا ہے سنگار
تو میں ہوں۔ تم ہو۔ تم جو ذہن کے پاتال تک پہنچتے ہو۔ اور سطح کریدکر نیچے
تک کو جھانکتے ہو۔ اور میں۔ میرے متعلق یہ ذکا کیا جانتا ہے۔ یہی نا کہ میں آوارہ گرد
ہوں۔ بیوی کی جنسی خواہشات سے غفلت برتتا ہوں اور اس کے زیور بیچ کھاتا
ہوں۔ اسے کیا پتہ کہ رشید قلعی گر کون ہے۔ رشید قلعی گر ایک شاعر ہے۔ ایک افسانہ نگار
ہے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک شاعر اور افسانہ نگار۔"

"لیکن میں تو صرف شاعر ہوں" محسن راڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا ہوا۔" رشید نے برجستہ جواب دیا۔ "شاعر افسانہ نگار سے زیادہ
اہم ہوتا ہے۔"

اسی طرح باتیں ہوتی رہیں۔ اور رشید قلعی گر، محسن راڈ کی ہر بات کی یوں حمایت
کرتا رہا، جیسے اپنی گذشتہ فروگذاشتوں کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے
محسن راڈ کی کئی غزلوں اور نظموں کی جی بھر کر تعریف کی۔ جب محسن نے اسے بتایا کہ
اس کی ایک غزل شمع کراچی کے آئندہ شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ تو اس نے
شمع کراچی کے "معیار" کی وہ ہوا باندھی کہ الاماں والحفیظ۔ اور میں ان جا و بیجا تعریفوں

پر محسن راؤ کا موافق ردّ عمل دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہا۔ پہلے پہل تو وہ کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتا تھا کہ میں بھی رشید قلعی گر کے خیالات سے متفق دکھلائی پڑتا ہوں یا نہیں مگر آہستہ آہستہ اس نے میرے ردّ عمل کو دیکھنا بھی چھوڑ دیا اور اپنی پوری توجہ رشید قلعی گر کی طرف مبذول کر لی۔ اس کی آنکھیں رشید قلعی گر کے چہرے کا مستقل طواف کرتی رہیں اور اس کے کان اپنی ساری قوتِ سماعت کے ساتھ اس کی باتیں سنتے رہے۔

"یار ذکائی" محسن نے ایک طویل وقفے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جب تک رشید قلعی گر یہاں ہے ہارون آباد کو ویران نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ میں تو ہارون آباد کو اوّل تا آخر میلہ مویشیاں سمجھ بیٹھا تھا۔ آج پھر میرا جی چاہ رہا ہے کہ ہارون آباد کے انسانوں کی آواز سنوں۔ یہاں کی ویرانیوں پر نہیں بلکہ رونقوں پر نظمیں لکھوں۔"

میں نے گھڑی دیکھی تو شام کے چار بج رہے تھے۔ اور باہر ہارون آباد کے قصبے پر دھند لکے اُتر آئے تھے۔ میں واپس اپنے گاؤں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم گھر جا رہے ہو" محسن نے کہا۔ "اچھا جاؤ۔ میں اور رشید ذرا اور گپیں اڑائیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے قدرے سرد مہری کے ساتھ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک ناقابلِ بیان موت کا سکون دیکھا۔ اور رشید سے

بھی ہاتھ ملا کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ لیکن فوارے والے چوک پر پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں کوئی سخت گیر اور جابر قسم کا ٹیچر ہوں۔ جس کا پیریڈ ختم ہونے پر لڑکے طمانیت کا سانس لیتے ہیں۔ اور میں نے اپنے سے پوچھا کہ محسن راؤ آخر کس قسم کا گدھا ہے؟

اس کے بعد کئی دنوں تک میں نے ہارون آباد میں نہ محسن راؤ کو دیکھا نہ رشید قلعی گر کو۔ پتہ نہیں سالے کہاں دفن ہو گئے تھے۔ ایک دن میں ڈاک خانے کے سامنے کھڑا تھا کہ رشید قلعی گر مل گیا۔ "تم تو کہہ رہے تھے اس دن اپنی بیوی کو لینے جا رہا ہوں۔ پھر کیا لے آئے اُسے — ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں — لیکن نہیں"۔ اس نے قدرے گڑبڑا کر کہا۔ "میں اُسے لینے نہیں جاؤں گا۔ وہ اپنے میکے میں عیش کر رہی ہے۔ میں کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کروں۔"

"کہاں ہوتے ہو آج کل۔ کبھی نظر ہی نہیں آتے — ؟"

وہ کچھ رُکا — جیسے اس سوال کا جواب نہ دینا چاہتا ہو۔ پھر ایک دم جانو بُکھلا کر کہنے لگا۔ "میں آجکل محسن کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"محسن کے ساتھ! " میں نے حیرانی سے پوچھا — "پنجاب ہوٹل کے کمرے میں۔ لیکن محسن تمہیں اپنے ساتھ رکھنے پر کیسے آمادہ ہو گیا۔ وہ تو ان دنوں بڑا مردم بیزار ہو رہا ہے۔ چچا معین کے آنے کا خط آیا تھا تو اس کے لئے ایک پرابلم اُٹھ کھڑی ہوئی تھی — اس کے علاوہ اُس دن کے بعد سے اب تک وہ

خنزیر کی اولاد مجھ سے بھی نہیں ملا"۔

"وہ مردم بیزار اس لئے تھا"۔ رشید نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔ "کہ اُسے اپنی مرضی کا کوئی آدمی نہ ملا تھا"۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم آخر اس کی مرضی کے آدمی کیسے بن گئے؟ ۔ میں بھی تو اس کا دوست ہوں۔ اور تم سے پرانا؟"۔

میری اس دلچسپی پر رشید بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں فتح مندی کے احساس سے چمک رہی تھیں۔

"بات یہ ہوئی کہ اُس دن تمہارے جانے کے بعد میں اور محسن کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ وہ مجھے بے حد جذباتی انداز میں اپنے بچپن کے حالات سُناتا رہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ چچا معین اس سے وہی سلوک کرتے رہے جو ایک پہلوان اپنے پٹھوں سے کرتا ہے۔ وہ اسے اپنے بیٹے سے زیادہ مردانگی کا ثبوت سمجھتے تھے۔ میں حیران ہوں کہ چچا معین ایسا ونڈرفل آدمی خوفناک بھی ہو سکتا ہے"۔ رشید قلعی گر نے ایک لحظے کے لئے رُک کر میری طرف دیکھا ۔۔۔ میں نے کندھے جھٹکا دیئے اور وہ کہتا رہا۔ "بہر حال جب اس سے یہ سارے قصے سُن کر میں جانے کے لئے اٹھا تو اس نے میرا بازو تھام لیا اور کہنے لگا کہ اگر تم واقعی شعر کہنا اور کہانیاں لکھنا چاہتے ہو تو جب میں یہاں ہوں تم یہاں میرے پاس رہو۔ میں بھی اکیلا ہوں اور تم بھی فارغ ہو"

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ ذکا! تم یقین نہیں کرو گے لیکن محسن نے یہی کہا تھا۔ محسن جو برف کی سل کی طرح سرد اور خاموش دکھائی دیتا ہے"۔
"بہت خوب"۔ میں نے سرد مہری کے ساتھ داد دی۔ تو تم آج کل محسن کا غم بٹا رہے ہو ۔۔۔ ہیں؟"
"ہاں میں اگلے دن ہی اپنے کپڑوں کا ٹرنک اور بستر پنجاب ہوٹل میں لے آیا تھا۔ اور اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے"۔
"ہاں ۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے"۔ میں نے اسی سرد مہری سے کہا۔
میں رشید قلعی گر کی باتوں پر سوچتا رہا۔ اور دو تین دن کے بعد پنجاب ہوٹل جا پہنچا۔ جب میں محسن کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ تنہا بیٹھا گنگنا رہا تھا رشید قلعی گر شاید کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پنجاب ہوٹل کا وہ صاف ستھرا چھوٹا سا کمرہ ایک کباڑ خانے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اور زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یہاں ایک نہیں بلکہ دو شاعر رہتے ہیں۔
"مجھے معلوم ہے کہ تم حیران ہو رہے ہو"۔ اس نے بے حد سرد اور پُر سکون لہجے میں کہا۔ " اور شاید میرے پاگل پن کو دیکھ کر تمہیں افسوس بھی ہو رہا ہو"۔
"نہیں محسن ہر گز نہیں۔ تم غلط سمجھے ہو۔ مجھے تو یہ سب کچھ دیکھ کر بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے"۔
"دلچسپی محسوس ہو رہی ہے ۔۔۔؟"۔ اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "ذکا"

کی حیثیت سے یا ایک کہانی کار کی حیثیت سے ؟"

"ایک دوست کی حیثیت سے "۔ میں نے جواب دیا۔

پہلے تو اس نے مجھے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ لیکن پھر یوں سر ہلانے لگا، جیسے یقین آگیا ہو۔ اور مجھے بے حد دھیمے، پُرسکون اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بتانے لگا کہ وہ بے یقینی اور مردم بیزاری کی کیفیت نہ معلوم اُسے کن ہولناک گھاٹیوں میں لے جاکر مار دیتی اگر وہ یہ محسوس نہ کرنے لگتا کہ اُس ہی جیسے ایک انسان کی طرف سے اُس پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں

"رشید پہلے بھی میرا دوست رہا ہے"۔ وہ کہہ رہا تھا "لیکن اس دفعہ اُس سے مل کر انسان پر میرا اعتماد بحال ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے وہ سکون بخش دیا ہے، جو مجھے حاصل نہ رہا تھا"۔ محسن کی آواز اداس تھی جیسے کوئی خزاں زدہ پتوں پر ہولے ہولے چل رہا ہو۔ "رشید کو جس چیز کی ضرورت تھی، لے دے کر ایک وہی چیز میرے پاس رہ گئی تھی، جو میں کسی کو دے سکتا تھا۔ یعنی باقاعدگی ــــ میں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے یہ چیز لے لے ...... لیکن کوئی نہ لیتا تھا۔ اور مجھ پر کرب کی کیفیت طاری ہوئی رہتی تھی۔ اور اب رشید نے اس کرب کو ختم کر دیا ہے۔ اس نے میرا تحفہ قبول کر لیا ہے۔ میں اُسے ہر صبح ٹھیک پانچ بجے جگا دیتا ہوں۔ اُٹھ کر وہ میرے ساتھ منہ ہاتھ دھوتا ہے۔ چھ بجے تک ہم ناشتہ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد میں اُسے ایک کونے میں بٹھا کر کہتا ہوں کہ

لکھو ایک کہانی یا کہو ایک غزل۔ وہ ہر روز ایک غزل کہتا ہے یا ایک کہانی لکھتا ہے۔ شام کو ہم سیر کرنے باہر کھیتوں میں نکل جاتے ہیں۔ آکر رات کا کھانا کھاتے ہیں۔ اور دس بجے سو جاتے ہیں۔ اس پروگرام سے روگردانی کرنے کی رشید کو قطعاً اجازت نہیں ملتی۔ خواہ کچھ ہو۔"

"رشید جیسے لاابالی اور آوارہ گرد کے لئے تو یہ چیز بہت اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہارے لئے اس میں سکون کا کونسا پہلو ہے"۔؟

اُس نے ایک لحظے کے لئے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ارے یہی تو میرا سکون ہے۔ کہ کوئی میرے پروگرام پر عمل کرے۔ میرے کہے پر چلے۔ اور تم کہتے ہو کہ اس میں میرے لئے سکون کا کونسا پہلو ہے۔ رہے نام آخر ذلک کے ذکا۔"

جب میں واپس اپنے گاؤں آ رہا تھا۔ تو سارے رستے محسن راڈ کی باتوں پر سوچتا رہا۔ اور اپنے ضمیر کی وہ موہوم سی آواز نہ دبا سکا جو رہ رہ کر مجھے کہہ رہی تھی، جو بار بار مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ یہ تم ہو ذکا جس نے محسن اور رشید کو یوں اکھٹا کیا ہے۔ لیکن ضمیر کی اس موہوم سی آواز کے باوجود۔ آخر میں کون تھا۔ یہ سمجھنے والا کہ رشید اور محسن کا یہ ملاپ بُری بات ہے۔ کسی بات کو اچھا یا بُرا قرار دینے کا مجھے کوئی حق حاصل نہ تھا۔ محسن راڈ کو میں نے اس وقت بھی دیکھا تھا، جب ہارون آباد میں آنے کے

بعد وہ ابھی رشید قلعی گر سے نہیں ملا تھا ۔۔۔ اور محسن راؤ کو میں نے آج بھی دیکھا تھا، جب وہ رشید قلعی گر کو اپنا نجات دہندہ قرار دے چکا تھا۔ آخر محسن کون ہوتا ہے رشید ایسے آوارہ گرد، لاابالی اور بے حیا لڑکے کی زندگی کو باقاعدگی دینے والا۔ اُسے کس خدا نے یہ پیغمبری سونپی تھی ۔۔۔؟ لیکن پھر وُہی بات ۔۔۔ مجھے کیا ضرورت ہے کسی پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی۔ اور دو دوستوں کے تعلقات کو اچھائی یا بُرائی کے ترازو میں تولنے کی؟

صورت حال کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ مجھے محسن اور رشید سے گویا از سرِ نَو دوستی کے ناطے قائم کرنے پڑے۔ اور میں نے نہ جانے کیوں، اپنی افتاد کے خلاف، اپنے کو ان کے سانچے میں ڈھال لیا۔ شاید اس لئے کہ مجھے کچھ دال میں کالا نظر آ رہا تھا۔ اور ایک کہانی کار کے فطری جذبۂ تجسس سے مجبور ہو کر میں یہ پتہ لگانا چاہتا تھا کہ دو مختلف ردیفیں، ایک ہی غزل میں کیوں اور کیسے کھپ گئیں ۔۔۔ چنانچہ میرے خوش آئند اور بظاہر بے پرواہ رویّے کے کارن وہ مجھے اکثر و بیشتر اپنی محفلوں میں مدعو کرتے رہے۔ لیکن پھر بھی ان دونوں کی جبلت فطرت اور حرکات و سکنات کچھ ایسی تھیں جیسے مجھ سے دُور دُور رہنا چاہتے ہوں۔ اگر میں کبھی وقت بے وقت پنجاب ہوٹل کے اس کمرے میں جا نکلتا، تو دونوں کے چہروں پر ناگواری

کی لکیریں اُبھر آتی تھیں۔ لیکن اس کا اظہار انھوں نے زبان سے کبھی نہیں کیا۔

اور پھر یوں ہُوا کہ جنوری کے پہلے دو ہفتے گذر گئے اور وہ مجھے نہ ملے۔ میلہ مویشیاں قریب آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ محسن، میلے کے شور و غل سے بچنے کے لئے، رشید کو ساتھ لے کر شاید فقیر والی چلا گیا ہے ـــ لیکن میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب ایک دن چچا معین کا یہ رقعہ ملا :۔

عزیزم ذکاء۔

خوش رہو۔ میں پرسوں ہارون آباد پہنچا تھا۔ راؤ فیاض الدین کے ہاں قیام ہے۔ اگر فرصت ہو تو کل دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ محسن اور اس کا "دوست" بھی ہوں گے۔ باقی باتیں عند الملاقات۔

والسّلام دعاگو : معین

چچا معین، محسن کے سب دوستوں میں سے مجھے قابل اعتبار اور شریف لڑکا سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میری تحریریں، فلمی رسالوں میں نہ چھپتی تھیں دوسرے یہ کہ میں پہلوانی کو ایک باقاعدہ فن تسلیم کرتا تھا۔ اور تیسرے یہ کہ چچا معین میرے والد کو بے حد پڑھا لکھا اور مخلص آدمی مانتے تھے۔

جب میں بڑے بازار کے پچھواڑے کی گلی میں راؤ فیاض کے مکان پر پہنچا تو چچا معین جو قطعاً نہ بدلے تھے، بیٹھک میں ایک موڑھے پر

براجمان تھے۔ انھوں نے اپنے تھل تھل کرتے جسم کو ایک قیمتی، نیلے کمبل میں لپیٹا ہوا تھا۔ ان کے بال اتنے سفید تھے کہ معلوم ہوتا تھا جیسے سر پہ برف جمی ہو۔ وہ اپنی موٹے موٹے پپوٹوں والی آنکھیں بند کیے حقہ پی رہے تھے۔ میری آہٹ سُن کر انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ اور مجھے دیکھ کر کھل اٹھے۔

"اوہ۔ ذکائی۔ آؤ بیٹے آؤ۔ لو بیٹھو یہاں"۔ انھوں نے دوسرا موڑھا گھسیٹ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

میں بیٹھ گیا۔ وہ میرے والد کی خیریت۔ اور فصلوں کی عام حالت دریافت کرتے رہے۔ اور جب رسمی باتیں ختم ہو گئیں تو کہنے لگے:

محسن کی سناؤ۔ کہتے ہیں کہ اس کی ایک لڑکے سے دوستی بڑھ رہی ہے۔ دیکھو میں تم پر اعتبار کرتا ہوں۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولنا"۔

میں اُن کے اس اچانک سوال پر بوکھلا گیا۔ "ہو گی، لیکن" غیر ارادی طور پر یہ الفاظ میری زبان سے پھسل گئے۔ وہ میری بوکھلاہٹ دیکھ کر زیر لب مسکراتے رہے۔ آخر میں نے اپنے کو سنبھال لیا۔ "اوّل تو یہ چچا کہ رشید لڑکا نہیں ہے"۔ میں نے سنبھلی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ عمر میں مجھ سے بڑا اور محسن کے برابر ہے ۔۔۔ اور اچھا خاصا آدمی ہے۔ شادی شدہ بھی ہے ۔۔۔ اور اس کی بیوی بے حد خوب صورت ہے"۔

"دیکھو ذکاالرحمٰن! مجھے اس کی بیوی کے حسن کے قصّے نہ سناؤ۔ میں نے دُنیا دیکھی ہے اور....." وہ کہتے کہتے رُک گئے۔ بیٹھک پر کوئی دستک دے رہا تھا۔

"آجاؤ بھئی آجاؤ ــ" بچا معین نے پکار کر کہا۔ دروازہ کھلا اور محسن اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے رشید قلعی گر تھا۔ اور بھیڑ کے بچے کی طرح سہما سہما، یتیم یتیم سا دکھلائی پڑ رہا تھا۔

وہ چپ چاپ موڑھوں پر بیٹھ گئے۔ بچا معین، محسن کو ڈانٹنے لگے کہ اتنی برادری کے ہوتے ہوئے وہ خواہ مخواہ ہوٹل میں کیوں ٹھہرا اور اگر برادری سے گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی تو ذکا تو کہیں نہ مرگیا تھا۔

"اچھا تو یہ ہیں تمھارے رشید صاحب۔" انھوں نے اسی تیز لہجے میں پوچھا۔ اور پھر رشید قلعی گر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "آپ کس قسم کے آدمی ہیں رشید صاحب؟..... میرا مطلب ہے کہ شاعر ہیں۔ افسانہ نگار ہیں۔ یا صرف....." وہ زبان پر آئی ہوئی ایک گندی سی بات کو روک گئے۔

"جی..... جی ــ میں تو کچھ بھی نہیں۔" رشید نے شرمائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "پہلے دوست تھا۔ یعنی..... ذکا اور محسن کا۔ اور اب محسن کا شاگرد ہوں۔" اس پر بچا معین نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"تو گویا یہ محسن۔ اب اُستاد بھی بن بیٹھا۔ اللہ پناہ دے ان شاعروں سے"۔ وہ بدستور ہنس رہے تھے۔ اور محسن سر جھکائے بیٹھا تھا۔

باتیں ہوتی رہیں۔ راؤ معین الدین احمد فلک شگاف قہقہے لگاتے رہے۔ رشید قلعی گر نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتا رہا۔ محسن راؤ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اور میں سگرٹ پیتا رہا۔

"اچھا بھئی رشید صاحب۔ میلہ شروع ہو رہا ہے۔ دنگل دیکھنے چلو گے نا ہمارے ساتھ"۔ چچا معین نے رشید قلعی گر سے پوچھا۔

اس پر وہ گڑبڑا گیا۔ اور بڑی بے بسی سے محسن کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا حرج ہے۔ چلے چلیں گے"۔ اُس نے بدستور محسن کی طرف دیکھتے ہوئے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ ہاں بھئی۔ ضرور چلنا۔ اور اس محسن کا تو دماغ خراب ہے۔ یہ تو آدمیوں سے یوں بھاگتا ہے جس طرح کوّا غلیل سے۔ ارے بھئی یہی تو عمر ہوتی ہے، ہنسنے کھیلنے کی۔ کیوں ڈاکا ۔۔۔؟ لوگ تو اس عمر کو ترستے ہیں اور یہ ابھی سے سنیاسی بن بیٹھے"۔

"کیوں بھئی محسن! چلے چلیں۔ کیا حرج ہے ۔۔۔!"۔ رشید نے ایک بار پھر محسن سے رائے لی۔

محسن نے سر اُٹھا کر اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اور تیز

لہجے میں کہنے لگا۔ "کہیں جاتے ہو تو کیا میری رائے لے کر جاتے ہو۔ جانا ہے تو ضرور جاؤ۔"

"بھئی ذکائی ــــ" چچا معین بدستور نفسیاتی حملے کر رہے تھے۔ "مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہوتا ہے۔ وقت سے پہلے کیوں بزرگ بن جاتے ہیں۔ مجھے دیکھو یہ عمر ہونے کو آئی، لیکن اب تک کھیل تماشوں سے جی نہیں بھرا۔" یکایک انھوں نے بات پلٹی۔ "اچھا بھئی رشید صاحب یوں نہیں۔ میلے میں جانا ہو تو آدمی ٹھاٹھ سے جائے۔ یہ کیا کہ چغدوں کی طرح ادھر ادھر گھومتے پھرے۔ "قادرے ــــ قادرے ــــ" انھوں نے ملازم کو آواز دی۔

مُسمسی صورت اور چندھیائی ہوئی آنکھوں والا قادرا آیا تو انھوں نے اُسے اپنا بٹوا لانے کے لئے کہا جو بستر پر سرہانے کے نیچے پڑا تھا۔ میں چچا معین کی اس ساری کارروائی پر حیران و ششدر تھا۔ اور میرے پلّے کچھ نہ پڑ رہا تھا۔ کہ آخر چچا معین کرنا کیا چاہتے ہیں۔

قادرا بٹوا لے آیا تو انھوں نے بٹوا کھولتے ہوئے کہا۔ "میلے میں کچھ ناچ گانے کا پروگرام بھی ہو گا۔ سُنا ہے ملتان کی رنڈیاں آئی ہیں۔ انھیں ویل دینی پڑے گی۔ تم ٹھہرے لڑکے بالے۔ تمہارے پاس کیا خاک ہو گا۔ یہ لو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ چچا معین کے ساتھ میلہ دیکھا تھا۔" انھوں نے

سو سو کے نوٹ ہم میں بانٹ دیئے۔

رشید قلعی گر کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اور سو روپے کا نوٹ اس کی انگلیوں میں کانپ رہا تھا۔

"اور ہاں بھئی رشید صاحب۔" انھوں نے رشید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "میرا ایک اور بھی اصول ہے۔ میلے میں دوستوں کی طرح جانا چاہیئے۔ بڑا چھوٹا بن کر نہیں۔ اس لئے میلے میں آپ مجھے معین کہیں گے۔ جیسے آپ اپنے ہم عمروں کا نام لیتے ہیں۔"

یکایک محسن منہ سے کچھ کہے بغیر تنتناتا ہوا اٹھا۔ اور باہر چلا گیا۔ چچا معین نے کوئی خاص پرواہ نہ کی۔ اور اپنی باتوں میں مصروف رہے۔ رشید نے محسن کے جانے کو پہلے تو کچھ محسوس کیا، لیکن پھر چچا معین کی باتوں میں گم ہو گیا۔ سو روپے کی رشوت لے کر وہ میلے پر جانے کی تو پوری حامی بھر ہی چکا تھا۔ اب وہ چچا معین کے بے تکلف رویّے سے شہ پا کر خود بھی بے تکلف ہو گیا تھا۔ اور چچا معین اس سے عورتوں کو گرم کرنے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنی کھلی کھلی باتیں کہ مجھے شرم محسوس ہو رہی تھی ــــ لیکن رشید کی شرم نہ جانے کہاں اڑ گئی تھی۔ آج میں اُس رشید کو دیکھ رہا تھا جو وہ کبھی ہوا کرتا تھا۔

محسن کھانے پر بھی نہ آیا۔ مجھے جلدی تھی اس لئے کھانا ختم ہوتے ہی میں نے

چچا معین اور رشید سے اجازت لی اور چلا آیا۔

واپس جاتے ہوئے ریلوے لائن کے پھاٹک پر محسن مل گیا۔۔۔ وہ بے حد جھنجھلایا ہوا اور اداس تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خزاں کی ویرانی اور ہونٹوں پر پت جھڑ کا عکس تھا۔

"دیکھا تم نے ذکا؟" اس نے دور کھیتوں سے پرے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابا پہلے تو رشید سے یوں ملے جیسے انھوں نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ میرے تمام پرانے دوستوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور پھر..... " وہ چند لمحوں کے لئے رُک گیا۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کیا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ "میرا سر پہلے ہی بھاری ہو رہا ہے...."

جب میں جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بے خودی کے عالم میں بڑبڑا رہا تھا۔

"میں نے رشید کو پہلے ہی ہوشیار کر دیا تھا۔ مگر اسے یقین نہ آیا تھا۔ اور اب......."

اور میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

اگلے دن میں باہر دھوپ میں بیٹھا ایک کہانی لکھ رہا تھا کہ محسن رادا آگیا۔ وہ بہت تھکا تھکا اور اُجڑا اُجڑا دکھلائی پڑ رہا تھا۔

"میں تم سے مدد مانگنے آیا ہوں ذکا!" اس نے اداس آواز میں کہا۔

"مدد۔ مجھ سے۔ بہر حال کہو۔ میں کوشش کروں گا۔"

"ہاں مدد۔" اس نے اداسی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہو مجھے کسی سے مدد مانگنے کی عادت نہیں ہے۔ لیکن آج میں مجبور ہو گیا ہوں۔"

"تم کہو تو سہی۔ آخر کیا چاہتے ہو محسن!۔۔۔؟"

"تم ابا کو جانتے ہو۔" اس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "تم ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ بھی تمھاری بات سنتے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہ خدا کے لیے رشید کو اپنا مصاحب بنا کر میلہ مویشیاں میں نہ لے کر جائیں۔"

"لیکن کیوں آخر؟"

"کیوں۔ تم پوچھتے ہو کیوں؟" ۔۔۔ اس نے تیز آواز میں پوچھا۔ "اُف خدا۔ یہ تم پوچھ رہے ہو۔ تم جو اپنے کو رشید کا دوست کہتے ہو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ رشید جس نے اب اپنی زندگی میں ایک باقاعدگی پیدا کر لی ہے، جس نے اب سنجیدگی سے لکھنا پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ جو اب صلاحیتوں کو ایک ڈھرے پر لا رہا ہے، پھر آوارہ گردی شروع کر دے۔ اس کا ذہن پھر منتشر ہو جائے وہ پھر رنڈیوں، میلوں کے بارے میں سوچنے لگے۔ وہ پھر اپنا وقت فضول ضائع کرنا شروع کر دے۔۔۔؟"

"لیکن چچا معین اسے ساری زندگی کے لیے تو میلے میں نہیں لیے جا رہے"

چند گھنٹوں کی سیر و تفریح سے کیا فرق پڑتا ہے ؟"

"چند گھنٹے" وہ تقریباً چلا اٹھا۔ "بھنگ کے چند گھونٹ ــــ افیم کی چند گولیاں"۔

"مگر میں چچا سے کیا کہوں ــــ ؟"

"اُن سے کہو" ــــ اس کے چہرے پر روشنی کی لکیریں اُبھر آئیں۔ "اُن سے کہو" اس کی آواز جھاڑ جھنکاڑ میں چیخنے والی طوفانی ہوا کی طرح پاگل ہو رہی تھی۔ "اُن سے کہو کہ جیسے آپ نے محسن کی زندگی سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ اسی طرح آپ رشید کی زندگی کے تھنوں میں سے دودھ کی آخری بوندیں بھی نچوڑ لیں۔ لیکن خدا کے لئے کراچی سے آکر اس دوستی کو تباہ نہ کریں جو محسن کو پتہ نہیں کتنی صدیوں کے بعد ملی ہے۔"

محسن ــ! میں چلایا۔

لیکن دریا میں طغیانی آچکی تھی۔ بپھرا ہوا پانی ہر بند کو کاٹ رہا تھا۔

"مگر۔ میں تم سے کیوں مدد مانگ رہا ہوں" وہ چیخ رہا تھا۔ "تم بھی ابا کی طرح بے رحم ہو۔ تم بھی اسی دنیا کے باشندے ہو جس میں ابا بستے ہیں تم کہانیاں لکھتے ہو لیکن تمہارا سینہ دل سے خالی ہے۔"

"اچھا بھئی اچھا۔ میں یہ سب کچھ ان سے کہہ دوں گا" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری مدد کروں گا۔

لیکن خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔" اس نے اپنے کندھے پر سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور مزید ایک لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر چلا گیا۔ میں پریشان سا ہو گیا تھا آج مجھے اس کے احساسات کی گہرائی کا اندازہ ہوا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ وہ اپنے والد کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ وہ اُن سے نفرت کرتا ہے ـــ اور مجھے اس کی یہ نفرت کچھ کچھ حق بجانب محسوس ہونے لگی۔ چچا معین جوانی میں جوانی کو اور زیادہ رنگین بنانے کے لیے ہنگاموں کی طرف لپکتے رہے۔ اور اب اپنے بڑھاپے کی ویرانی کو سجانے کی خاطر رنگینیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مسرتوں، اپنی خوشیوں کی قربان گاہ پر اپنے بیٹے کو بھی بھینٹ چڑھا دیا۔ محسن ـــ جو بے حد اکیلا، تنہا اور اداس بچہ تھا۔ انھیں اس کی تنہائیوں کا کبھی خیال نہ آیا۔ انھوں نے اس کی اداسیوں میں کوئی پھیکا رنگ بھی نہ بھرا۔ جیسے انھیں چڑ ہو کہ محسن راؤ ـــ ان کا اکلوتا بیٹا ـــ ایک شعلہ نما جذبے کی آنچ میں کیوں سلگتا ہے۔ جیسے وہ اس شعلہ نما جذبے کو بجھا دینا چاہتے ہوں ـــ مگر کیوں ـــ؟

میں نے اسی وقت چچا معین کے نام ایک رقعہ لکھا۔ جس میں اُن سے درخواست کی وہ آج دوپہر کا کھانا میرے ساتھ یہاں گارڈن میں آکر کھائیں۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے بعد دوپہر چچا معین تانگے میں تشریف لے آئے وہ حسب معمول بے حد خوش تھے۔ آتے ہی انھوں نے مجھ پر دو چار فقرے

چُست کیئے۔ اور جیسا کہ میرا پہلے سے خیال تھا۔ رشید کے بارے میں میری بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

"آخر اس میں حرج کیا ہے ــــ ؟" انھوں نے پوچھا۔ "کیا تم لوگوں کا کوئی اور پروگرام بن گیا ہے ــــ ؟"

"جی نہیں۔ میں صرف محسن کی خاطر کہہ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لئے بے حد پریشان کُن ہے"۔

"کیوں ــــ اُس کے لئے پریشان کُن کیوں ہے"۔ ان کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک آگئی تھی۔ جیسے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے کھیلتے انھوں نے گلی بوچ لی ہو۔

"یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں"۔ میں نے تھکی تھکی آواز میں جواب دیا۔

"ذکا بیٹے" ــــ انھوں نے مستحکم لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "میں بہت سی باتیں جانتا ہوں"۔

"آپ نہیں سمجھتے ہچا"۔ میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ "محسن کا خیال ہے کہ رشید میں اب باقاعدگی آگئی ہے۔ اور اس نے سنجیدگی سے پڑھنا لکھنا۔۔۔۔۔۔"

"سب بکواس ہے"۔ ہچا نے بات کاٹی ــــ "یہ خود غرضی ہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک خود غرضی ــــ محسن بزدل ہے۔ ڈرپوک ہے۔ اُسے ڈر ہے کہ

رشید اتنی بڑی دنیا کی زندگی دیکھ کر اس کے تنگ و تاریک حجرے سے بھاگ نکلے گا۔ زندگی کے بھڑکیلے رنگ اسے ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ لیں گے اور وہ محسن سے باغی ہو جائے گا۔ اور یہی میں چاہتا ہوں۔"

"چچا۔" میں نے مایوس ہو کر کہا۔ "اگر کسی کا جانا ضروری ہے۔ تو میں آپ کے ساتھ میلے میں چلوں گا۔ لیکن ......"

"تم تو خیر چلو گے ہی۔" چچا نے پھر میری بات اُچک لی۔ "لیکن تمہارے جانے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رشید میرے ساتھ ضرور جائے گا۔ اُسے محسن بھی نہیں روک سکتا۔ اونہہ۔ بڑا آیا اس کی زندگی میں باقاعدگی پیدا کرنے والا۔ تم سمجھتے ہو کہ پنجاب ہوٹل میں دن رات بسر کرنے سے رشید کی زندگی میں باقاعدگی پیدا ہو گئی ہے ــــ میں اس باقاعدگی پر اُس آوارہ گردی کو ترجیح دیتا ہوں جو، خواہ گھنٹوں کے لالچ میں سہی ــــ رشید کو یہ اجازت دیتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھے۔ یہ خوب ہے کہ رشید تو محسن کے ساتھ رہ کر باقاعدگی پیدا کرتا پھرے اور اس کی بیوی میکے میں بیٹھی لوگوں کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہو۔ لعنت ہے اس باقاعدگی پر۔"

میں خاموش ہو گیا۔ چچا کا چہرہ مارے غصے کے سُرخ ہو رہا تھا ــ اور میں بھلا محسن کی مزید وکالت کیا کر سکتا تھا۔ جبکہ اس کا باپ، اس کے بارے میں یہ خیالات رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے محسن کے نام ایک خط لکھا، کہ اپنی

ناکامی کے بعد مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اس کا سامنا کر سکوں۔ خط میں مجھے لکھنا پڑا کہ چچا معین نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے اور میں قطعی بے بس ہوں۔

یہ خط اپنے ملازم کے ہاتھ میں نے محسن کو بھجوا دیا۔

چار دن گذر گئے۔ اور اس عرصے میں نہ تو محسن سے ملاقات ہوئی اور نہ رشید ملا۔

ایک دن میں کسی کام سے کواپریٹو کمیشن شاپ گیا۔ باہر نکلا تو رشید سڑک پر کھڑا میرا منتظر تھا۔ مجھے اس نے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور کہنے لگا:

"مجھے تم سے کچھ باتیں کہنی ہیں"

"کہو۔ کہو۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"اگر فارغ ہو تو پنجاب ہوٹل میں آجانا۔ شام کی چائے وہیں پینا۔ ہم کچھ (change) چاہتے ہیں"۔

"کیوں۔ ایک دوسرے سے اُکتا گئے ہو کیا۔"

"نہیں۔ ایسا تو نہیں ہے ۔۔۔ لیکن میں محسن کے بارے میں فکر مند ہوں۔ وہ ہر وقت یہی کہتا رہتا ہے کہ میں چچا معین کے ساتھ میلے میں نہ جاؤں اور

اس کے ساتھ فقیر والی چلوں۔"

"تو کیوں جاتے ہو میلے میں بچا معین کے ساتھ۔ نہ جاؤ۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔

"کیوں نہ جاؤں"۔ اس نے احتجاج کیا۔ "چند دنوں کے لئے محسن کے ساتھ رہنے اور اس سے غزلوں نظموں پر اصلاح لینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ساری دنیا سے کٹ کر رہ جاؤں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں محسن کا زر خرید ملازم ہوں؟"

رشید کے ہونٹوں پر ایک الجھی الجھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جب اس کی بیوی اُسے اپنے ساتھ رات گذارنے، آوارہ گردی چھوڑنے، اور گھر میں رہنے کے لئے کہتی ہو گی تو اس وقت بھی اس کے ہونٹوں پر ایسی ہی مسکراہٹ پھیل جاتی ہو گی۔ رشید اپنی زندگی کے خوشگوار اور تلخ حقائق کو ٹال لینے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ بہر حال جب میں نے اس مسکراہٹ کا جواب سنجیدگی سے دیا تو وہ بھی سنبھل گیا۔

"یہ غلامی کا سوال نہیں ہے۔ یہ تو معاوضے کا سوال ہے۔ محسن نے تمہاری زندگی کا ڈھرّا بدل دیا۔ تمہاری آوارہ گیوں کو ختم کر دیا۔ تمہاری تربیت کی۔ کیا ! تنی خدمات کے صلے میں تم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اس کی ایک ذرا سی بات مان لو۔؟"

"محسن نے اب تک مجھے اخراجات کے لیئے جتنے پیسے دیئے" اس

نے بڑے اعتماد اور وقار سے کہنا شروع کیا۔ "وہ مجھ پر قرض ہیں۔ اور جونہی میرے حالات ٹھیک ہوئے میں اس کی دی ہوئی پائی پائی لوٹا دوں گا۔ ویسے اس نے مجھ پر کچھ زیادہ خرچ نہیں کیا۔ یہی کوئی چار سو روپے بنتے ہیں۔"

رشید کی اس بات سے میں چڑ گیا۔

"اتنے ہی غیرت والے ہو تو اس کے ساتھ کیوں رہتے ہو۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ صرف میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ اور وہ میرے ساتھ نہیں رہتا۔" اس نے پلٹ کر کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم تصویر کا صرف ایک پہلو دیکھتے ہو۔ تم نے وہ ہذیان نہیں سُنا، جو وہ آج کل دن رات بکا کرتا ہے۔"

"کیا ہذیان۔۔۔؟"

رشید نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ آج کل محسن دن رات چچا معین اور میلہ مویشیاں کی شان میں کیسے کیسے قصیدے دن رات پڑھتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ محسن تقریباً پاگل ہو چکا ہے۔ اور ہر وقت اس کی خوشامدیں کرتا رہتا ہے کہ وہ راؤ معین احمد کے ہمراہ میلہ مویشیاں دیکھنے نہ جائے۔ حتیٰ کہ اس نے رشید کو یہ بھی انتباہ کیا کہ میلے میں جب لوگ اُسے چچا معین کے ساتھ دیکھیں گے تو اس کے کردار پر انگلی اٹھائیں گے۔

ہم لوگ سڑک کے کنارے پر ہی کھڑے تھے اور رشید مجھے یہ افسوسناک کہانی، پوری جزئیات کے ساتھ سنا رہا تھا۔ شاید اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ محسن نے اگر اس کے ساتھ کوئی بھلائی کی ہے تو صرف اپنی مجروح انا کی تسکین کی خاطر۔

"تم الو کے پٹھے ہو رشید" ــــ مجھ سے آخر نہ رہا گیا اور میں چیخ اٹھا "احسان فراموش۔ کمینے۔ تم واقعی وہی ہو، جو لوگ تمہیں سمجھتے ہیں۔"

اس نے احتجاج کے لئے منہ کھولا۔ لیکن میں جلدی سے مڑ کر کواپریٹو کمیشن شاپ میں چلا گیا ــــ وہ کچھ دیر تک تو ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر سر جھکائے، آہستہ آہستہ چلتا ہوا غلہ منڈی کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔ میں نے واپس آ کر کھانا کھایا۔ لیکن ذہن میں ایک طوفان بپا تھا۔ طبیعت کو کسی کل چین نہ تھی۔ وہ رات مجھ پہ بہت بھاری گذری اور میں لکھنے پڑھنے کا کوئی کام نہ کر سکا ــــ مجھے رہ رہ کر رشید قلعی گر کی گندی ذہنیت کا خیال آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس شخص نے نہ صرف اپنی زندگی برباد کی بلکہ اپنے ماں باپ کا بڑھاپا بھی ویران کیا۔ اپنی معصوم بیوی کی جوانی کو بھی گھن لگا یا۔ حتیٰ کہ پیسے کے لئے اپنے آپ کو بھی جنس کی طرح سرِ بازار بیچ دیا۔ مجھے اس کی اسکول کی زندگی یاد آ رہی تھی جب وہ پاس ہونے یا زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لئے اپنی کئی راتیں مختلف ٹیچروں کی نذر کر دیتا

تھا۔ اگر یہ شعر نہ کہتا اور اچھا ڈیبیٹر نہ ہوتا تو شاید یہ میرے دوستوں کے حلقہ میں شامل ہی نہ ہوتا۔ یوں تو میں یہ کہہ کر اپنے کو تسلی دے رہا تھا کہ آج رشید کو آئینہ دکھا کر میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ لیکن دل میں ایک پھانس اٹکی تھی۔

مکافات کے لئے مجھے زیادہ عرصہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ تین چار دن کے بعد مجھے ہارون آباد کے ایس۔ ایچ۔ او سے ملنے تھانے جانا پڑا۔ میں فوارے والے چوک سے مڑا ہی تھا کہ پنجاب ہوٹل کے سامنے مجھے محسن دکھلائی پڑ گیا۔ وہ ہوٹل کے مالک سے کوئی بات کر رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی لیکن ہوٹل کا مالک مجھے دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میری طرف اشارہ کر دیا۔ محسن نے اپنی گردن موڑی اور مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر سرسوں پھیلی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بالکل ساکت اور تھکی تھکی سی تھیں۔ پہلی نظر میں وہ محسن راو معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔

وہ چلا گیا ہے۔" میرے قریب پہنچنے پر اس نے کہا۔ "کہہ کر گیا ہے کہ میں ملتان جا رہا ہوں۔ کہتا تھا کہ میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔" اس نے مجھے بڑی خوفناک باتیں سنائیں۔

"خدا کے لئے محسن! میرے ساتھ چلو — مجھے تھانے میں کچھ کام ہے۔

وہاں سے فارغ ہو کر، ذرا کھُلی ہوا میں گھومیں گے۔"
وہ پالتو کتے کی طرح بغیر کچھ کہے۔ میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ نہانے سے فارغ ہو کر، ہم کھیتوں میں سے ہمتے ہوئے، ٹہلتے ٹہلتے گاؤں آ گئے۔
اُس نے مجھے بتایا کہ تم نے اسے بڑے نازیبا لفظ کہے۔
میں خاموش رہا۔
"کیا خیال ہے تمہارا" وہ بڑی مایوس اور تھکی آواز میں کہتا رہا — "کہ ہم دونوں ملتان چلیں اور تم اس سے معافی مانگ لو اس طرح شاید وہ واپس آ جائے۔" میں نے اپنے کندھے جھٹکا دیئے۔
"بولو نا — کیا وہ واپس آ جائے گا۔" وہ میرے اظہارِ خیال پر مُصر تھا۔
"محسن"۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "خدا کے واسطے اُسے ملتان میں ہی رہنے دو۔ اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں رشید سے نجات دے دی۔ تم اس لڑکے کو اچھی طرح نہیں جانتے محسن — جیسا کہ تمہیں معلوم ہے وہ میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے — اور تمہارا صرف دوست تھا۔ میں اس کی ایک ایک رگ سے واقف ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں دوبارہ اُس سے ملایا — حالانکہ وہ بھول جانے کے قابل تھا۔"
"افسوس —؟" محسن میں جیسے دوبارہ زندگی پیدا ہو گئی — "تمہیں افسوس ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تمہارا مجھ پر سب سے بڑا احسان تھا۔

تم نے میرے لئے وہ کچھ کیا جو اب تک کسی نے نہیں کیا تھا۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ رشید میرے لئے کیا تھا۔ ؟"

"شاید۔ کچھ کچھ جانتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اِس پر وہ بُری طرح بپھر گیا۔ میں آج پرانی محفلوں کے محسن کو دیکھ رہا تھا، جو ناراض ہوتا تھا تو طوفان بن جاتا تھا۔

"شاید۔ کچھ کچھ جانتا ہوں۔" اس نے طنزیہ انداز میں میرے الفاظ دُہرائے۔ "معاف کرنا ذکا! اپنے بے پناہ مطالعے اور اپنی بعض خوبیوں کے باوجود تم ابّا سے مختلف نہیں ہو۔ تم بھی مجھے خوش نہیں دیکھنا چاہتے۔ جب تک میں خوشی کے حصول کے لئے تم لوگوں کے بنائے ہوئے اصولوں پر نہ چلوں۔ تم لوگ جو اپنے کو سوسائٹی کہتے ہو۔ تم نے خوشی اور غم کے لئے بھی اپنی تعزیرات مرتب کر رکھی ہے۔ جو شخص اس تعزیرات کو نہیں مانتا اُس کے تم دشمن ہو جاتے ہو۔ چنانچہ جب میں نے بھی اِک ذرا سی بغاوت کر کے خوشی حاصل کی تو تم نے اور ابّا نے میرے اور رشید کے تعلقات کو شکوک کی جولاں گاہ بنا دیا۔"

"لیکن محسن۔ میں نے کبھی ......"

"چپ رہو۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "دراصل تم لوگ اپنے کو فرشتے سمجھتے ہو۔ میں حیران ہوں کہ تم، جو اتنی اچھی کہانیاں لکھتے ہو۔ تم جو انسان کو

مجھسے کا دعویٰ کرتے ہو۔ تم بھی اُس محبت کی نوعیت کو نہ سمجھ سکے جو مجھے رشید سے ہے —— وہ محبت۔ جس کے لئے میں زندگی بھر ترستا رہا ہوں۔"

پھر وہ اٹھا اور خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔

میں بُت کی طرح بیٹھا رہا۔ مگر پھر یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مایوسی کے عالم میں مجھے اُسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔"

میلے کی رات میں اور محسن گھومنے کے لئے فورٹ۔ آر نہر پر چلے گئے۔

ہارون آباد، فورٹ۔ آر۔ نہر کے کنارے آباد ہے۔ مشرق میں اس نہر کے کنارے جہاں ہارون آباد کی حدیں ختم ہوتی ہیں —— وہاں ایک وسیع میدان ہے۔ اسی میدان میں سالانہ میلہ مویشیاں لگتا ہے —— اس جگہ فورٹ۔ آر نہر دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ اس لئے اس جگہ کو دوشاخہ کہتے ہیں۔ میں اور محسن نہر کے کنارے ٹہلتے ہوئے دوشاخہ کی طرف ہی جا رہے تھے۔ میلے کا شور و غل دور سے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ نہر کا پانی اس قدر شفاف تھا کہ چاندنی بھی اس پر سے پھسلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

رشید، ملتان چلا گیا تھا۔ میں نے اُس دن کے بعد سے چچا معین کی شکل بھی نہ دیکھی تھی —— اس لئے شاید وہ تنہا میلہ دیکھنے چلے گئے تھے۔

ٹاہلیوں کی اوٹ میں میلے کے چراغوں کی جھلملاہٹ، شاید آسمان کے

مدھم ستاروں کا مذاق اڑا رہی تھی۔ آخری تاریخوں کا چاند ہمارے سروں پر تیر رہا تھا۔ اُف! میرے خدا کتنی سحر آلود تھی وہ دودھ کی طرح کنواری زمستاں کی رات۔ جیسے آسمان کے جادوگروں نے اپنے تمام منتر پھونک دیئے ہوں۔

"دو پتر اناراں دے۔۔۔

سادڑا دُکھ سن سن کے

روندے پتھر پہاڑاں دے۔"

دُور میلے سے رِنگ کی لَے پر ایک اُداس آواز ابھری۔ اور رات کی پہنائیوں میں گونج گئی۔۔ محسن نے ٹھٹک کر میرا کندھا تھام لیا۔

"کیا اس میلے میں بھی کچھ اداس اور دُکھی لوگ ہیں؟"۔ اُس نے مجھ سے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے یوں جواب دیا کہ مجھ سے اپنی آواز بھی پہچانی نہ گئی۔

ہم چلتے چلتے دوشاخے پر آ گئے۔ ہمارے سامنے دوسرے کنارے پر میلہ، اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ بکھرا ہُوا تھا۔ معاً ایک طرف ایک قہقہہ گونجا۔ محسن نے جلدی سے میلے کی طرف پیٹھ کر لی۔ لیکن اتنی جلدی بھی نہیں کہ وہ راؤ معین الدین احمد کو دیکھ ہی نہ سکا ہو۔ انھوں نے سُرخ پگڑی باندھ رکھی تھی اور وہ ایک لڑکے کے ہمراہ میلے کے ہجوم میں قہقہے لگاتے ہُوئے خوش خوش پھر رہے تھے۔ وہ لڑکا کون تھا۔۔۔ یہ ہمیں دیکھنے کی کیا ضرورت تھی

محسن مڑا اور اُلٹے پیر نہر کے کنارے کنارے واپس ہو گیا۔ میں نے اس کے پیچھے جانا مناسب نہ سمجھا۔ اور وہیں سے پکار کر کہا۔ "محسن! میں میلہ دیکھنے واپس جا رہا ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ چاندنی میں لہرا دیا۔ جیسے مجھے الوداع کہہ رہا ہو۔

---

# چھوٹی سی دُنیا

گلاب علی ہیڈ ورکس سے دو نہریں ایک ساتھ پھوٹتی ہیں اور پھر ان کا درمیانی فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے، وہ چھوٹا سا گاؤں اسی درمیانی فاصلے میں آباد ہے ــــ دراصل اس گاؤں کو گاؤں کہنا درست نہیں ــــ چند کھیت ہیں اور ان کھیتوں کے پرلے کنارے پر ایک کچا مکان ہے اور مکان کے چاروں طرف گھاس پھونس کی چار چھ جھونپڑیاں ہیں ــــ ان میں سے کچھ جھونپڑیوں میں ڈھور ڈنگر باندھے جاتے ہیں۔ اور کچھ غلہ اور چارہ وغیرہ رکھنے کے کام آتی ہیں۔

مکان کا صحن بہت وسیع و عریض ہے اور اس میں کیکر کا ایک گھنا درخت بھی ہے۔ جب گرمیاں آتی ہیں تو یہ درخت زرد زرد پھولوں سے لد جاتا ہے اور ان پھولوں کی ہلکی ہلکی اور نامعلوم سی مہک سارے مکان میں

یوں پھیل جاتی ہے جیسے کوئی بہت پراسرار آہستہ آہستہ فاش ہو رہا ہو۔ — یہ موسم گزیدہ کچّا مکان جس کی تعمیر میں کسی فن کاری یا نزاکت کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ سارے منظر کا اسی طرح ایک حصّہ ہے جس طرح وہ کھیت جن میں فصلیں پکتی ہیں۔ یا وہ درخت جنھوں نے کھیتوں کو اپنے سایہ دار حصار میں لے رکھا ہے۔

نہر کے کنارے سے ایک نازک سی پگڈنڈی اُس مکان تک جاتی ہے۔ — اس پگڈنڈی کے دونوں طرف سفید گلاب کے جھاڑ ہیں۔ جو اگر ہسپانیہ میں ہوتے تو الحمرا کا سنگھار ہوتے۔ لیکن گلاب علی ہیڈ ورکس کے نزدیک ایک دور افتادہ منتے سے گاؤں میں ہیں، اس لئے ایک پگڈنڈی کا سہاگ ہیں۔

اس مکان میں رہنے والے اور ان کھیتوں میں کام کرنے والے بے حد دیانت دار مضبوط اور سچے لوگ ہیں۔ ان کے نزدیک ناز کی پونجی بس یہی ہے کہ ان کی تین نسلوں نے اسی مکان میں جنم لیا۔ انھی کھیتوں میں محنت کی اور یہیں موت کا جوگ لیا۔ وہ گزشتہ پچاس برس سے اردگرد کی زمین کا سینہ چیرتے رہے تھے اس میں بیج ڈالتے رہے تھے اور فصلیں کاٹتے رہے تھے۔

وہ اس زمین کا مقدر تھے۔ اور یہ زمین ان کی قسمت تھی۔

ستیہ مُہل اب چالیس برس کے لگ بھگ تھا اور اس کی بیوی اس سے دو ایک سال چھوٹی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔

ناقابل شکست عزم کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اور زندگی کا پورا لطف اٹھاتے
تھے۔ ان کے چار بچے دو لڑکیاں اور دو لڑکے خوب صورت توانا اور محنتی
تھے ـــــ ان لوگوں نے کبھی زیادہ کی تمنا نہیں کی۔ اور خدا نے کبھی تھوڑا
دیا نہیں۔ انھیں اپنا مقام معلوم تھا ـــــ اس مقام پر شاید انھیں نئی تہذیب
کی چکا چوند روشنی تو میسر نہ ہو لیکن سکون اور طمانیت کی دولت ضرور نصیب
تھی ـــــ میں نے اتنے خوش، ہشاش بشاش مہربان اور مہمان نواز کنبے بہت
کم دیکھے ہیں ان کی زندگی بہت منظم تھی۔ بڑی مکمل تھی۔ اور اس تنظیم و تکمیل
نے ان کی زندگی کو وہ حسن بخشا تھا جو موسیقی کے ایک خوب صورت ٹکڑے
اور ایک عمدہ تصویر میں ہوتا ہے ـــــ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس گاؤں
اور اس کنبے کی سربراہی ستیہ مہل کی بجائے اس کی بوڑھی ماں کے سپرد
تھی۔ آس پاس کے لوگ کہتے تھے کہ ستیہ مہل کی ماں بڑی جی دار عورت ہے
وہ اپنے بیٹے سے بڑھ کر محنت کرتی تھی۔ اور بڑھاپے کے باوجود اس نے
کام اور صرف کام میں آرام کے پہلو تلاش کئے تھے۔ اس کی عمر ساٹھ سال تھی لیکن
کمر میں اب تک کوئی جھکاؤ نہ آیا تھا۔ جسم لمبا تڑنگا۔ گردن عمودی۔ بال کپاس
کے گالوں ایسے سفید۔ چہرہ جھریوں بھرا لیکن باوقار، اور آنکھیں بیلوؤں
کی مانند سرخ اور چمکدار تھیں۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اس چھوٹی سی
دنیا کا قانون بن جاتا تھا۔ لیکن اتنے اختیار اور وقار کے باوجود اُس کی

شخصیت میں ربودگی کے بجائے ایک موہ لینے والی ملائمت تھی، وہ ایک مہربان ماں تھی۔ ایک نرم خو ساس تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک عورت تھی۔

اس کنبے سے میرا تعارف اس وقت سے تھا۔ جب ہارون آباد اور بہاول نگر کے درمیان ابھی پکی سڑک نہیں بنی تھی۔ اور ہم جیپ میں نہر کے کنارے کنارے بہاولنگر جایا کرتے تھے۔ اور ہماری جیپ عین اُس جگہ خراب ہوا کرتی تھی۔ جہاں ان چند کھیتوں، چار جھونپڑیوں اور کچے مکانوں کی یہ چھوٹی سی دُنیا آباد تھی۔ ایک دن میں جیپ میں بہاولنگر سے آرہا تھا، کہ میری نظر ستیہ نہل کی ماں پر پڑ گئی۔ وہ شاید نہر سے پانی لینے آئی تھی۔ چونکہ اس نے چند گھڑے سر پر اٹھا رکھے تھے۔ اور کچھ گھڑیاں اپنی بغلوں میں دبائی ہوئی تھیں۔ اور وہ نہر کے کنارے پر کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں نے جیپ آہستہ کر لی۔ وہ حسب معمول آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ لیکن آج اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی تابانی تھی۔ ایک غیر معمولی سا الھڑپن تھا۔ جو اس عمر کی عورتوں میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

"کہو اماں کیا حال چال ہیں؟" میں نے عین اس کے قریب جا کر جیپ کو بریک لگائی۔

"ہائے، ہائے وے اڑیا میں تو ڈر ہی گئی تھی۔" اس نے ایکٹنگ کی جیسے

اس نے جیپ کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔

"کیا بات ہے آج بہت خوش ہو۔" میں نے جیپ سے اُترتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بھی بے ساختہ مسکرا اُٹھی۔

"تجھو پتہ بھی ہے آج ہمارے گھر کون آ رہا ہے ——— منظوراں کا ابا۔ یعنی ستیہ کا سُسر اور میرا دیور۔"

"اچھا۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ مر چکا ہے۔"

"ہائے ہائے وے اڑیا۔ مریں اس کے دشمن ——— پر خیال ہمارا بھی یہی تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ اور یہی تو خوشی کی بات ہے۔ کہ وہ زندہ ہے۔ اور آج آ رہا ہے۔" اس نے بغلوں میں دبائی ہوئی جھجریاں زمین پر رکھتے ہوئے کہا ——— اس کی مسکراہٹ کی تابانی اور الھڑ پن اور بڑھ گیا۔

میں اس کنبے سے شانو مہل کی کہانی کئی بار سُن چکا تھا۔ اور ہر بار مجھے یوں لگا تھا جیسے میں بہاولپور کا کوئی قدیم لوک گیت سُن رہا ہوں ——— اب اس گیت کے مرکزی کردار کو حقیقت کی دنیا میں دیکھنے کا خیال بھی دل میں سرسراہٹ سی پیدا کر رہا تھا۔

ستیہ کا باپ جانو مہل اور شانو مہل سگے بھائی تھے۔ جانو بڑا تھا۔ اور شانو چھوٹا۔ دونوں نے ستیہ کی ماں سے محبت کی تھی۔ وہ ان دنوں سولہ برس کی ایک نٹ کھٹ چھوکری تھی۔ حالات کے ایک نازک موڑ پر ستیہ کی ماں

نے جانو کا دامن تھام لیا۔ اور شانو یہ چھوٹی سی دُنیا چھوڑ کر دریائے ستلج کے کنارے ایک بستی میں جا بسا۔ اور وہاں اس نے ایک خانہ بدوش لڑکی سے شادی کرلی۔ زخموں پر وقت نے مرہم رکھ دیا اور دونوں بھائی پھر آپس میں ملنے جلنے لگے تھے ـــــ شانو نے اپنی بیٹی کا رشتہ اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دیا ـــ اسی اثنا میں اس کی بیوی ہیضے کا شکار ہو گئی۔ اور شانو دریا کے کنارے والا گاؤں بھی چھوڑ کر انجانے نگروں کی طرف ایسا نکلا کہ گھر کا راستہ بھول گیا۔

سینۃ کا باپ مرگیا۔ سینۃ چار بچوں کا باپ بن گیا۔ سینۃ کی ماں بوڑھی ہوگئی۔ لیکن شانو کا کوئی اتا پتہ نہ ملا کہ کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے۔ سینۃ نے سلیمانکی ہیڈ ورکس سے لے کر اسلام ہیڈ ورکس تک ستلج کا سارا ساحل چھان مارا۔ سینۃ کی بیوی نے راتوں کو رو رو کر اپنے باپ کی زندگی کی دعائیں مانگیں مگر اس کی زندگی کا سراغ ملا نہ موت کا۔ اور جب اس کے بارے میں سوچتے سوچتے ان کے دماغ تھک گئے تو ان کے سامنے موت کا تاریک دائرہ منڈلانے لگا۔ اور شانو کا وجود انھیں اس دائرے میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ لیکن تین دن پہلے نہ جانے کہاں سے ایک بوسیدہ سا پوسٹ کارڈ آیا۔ موت کے تاریک دائرے سے زندگی کی شعاعیں پھوٹ نکلیں ـــــ

شانو مہل زندہ تھا۔ آج وہ اس چھوٹی سی دنیا میں واپس آرہا تھا۔ اور سینۃ مہل

کی ماں جیپ کے پاس کھڑی مجھ سے کہہ رہی تھی۔
"ہائے ہائے وے اڑیا میں اس کے دشمن ....."
"تو اماں آج تمہیں بہت خوشی ہے؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔
"ہاں وے اڑیا خوشی تو بہت ہے۔ پر تھوڑا سا غم بھی ہے۔" اس کی کھنکتی ہوئی آواز میں اداسی گھل مل گئی۔
"غم..... لیکن کس بات کا غم؟" میں سراپا حیرت بن گیا۔
"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس پتہ نہیں کیوں — بھلے نے اپنے کارڈ میں یہ لکھوایا ہے کہ میں اس لئے واپس آرہا ہوں کہ اب مجھے اپنی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں رہا۔ میں اپنی بیٹی اور بھتیجے کو آخری بار دیکھنا چاہتا ہوں — بس اسی بات سے دل — پتہ نہیں کیوں — کبھی کبھی — بیٹھ سا جاتا ہے وہ تو بڑے دل والا آدمی تھا — اس نے ایسی بات کیوں لکھائی؟"
میں نے سگریٹ سلگا لیا اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ سکینہ مہل کی ماں نے جھریاں اٹھاتے ہوئے مجھے کل اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس کی دعوت میں اس دیہاتی عورت کا سارا خلوص، سادگی اور بے ساختہ پن تھا۔ جس نے ہارون آباد اور بہاولنگر کے علاوہ کوئی شہر نہ دیکھا تھا۔ میں انکار نہ کر سکا۔ کوئی بہانہ بھی نہ تراش سکا۔ اور کل آنے کا وعدہ کر کے میں نے جیپ کو شام کے لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے سایوں میں چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار

سے دوڑا دیا۔
اگلے دن جب میں ان کے ہاں پہنچا تو سرما کی صبح کی کہر ابھی تک فضا میں تیر رہی تھی۔ اور ان کا سارا کنبہ باورچی خانے میں چولھے کے ارد گرد بیٹھا تھا۔ چولھے میں شیشم کی لکڑیاں سُلگ رہی تھیں۔ سینۃ کی ماں کے چہرے پر کئی پُرانے خوابوں کا عکس تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس نے آج بہترین لباس پہن رکھا تھا ـــــ ٹخنوں تک ریشمی چولا۔ نقرئی حاشیئے والی سبز دھوتی اور نری کی سُرخ جوتی ـــــ اس کے قریب ہی سینۃ مہل اس کی بیوی، اور چاروں بچّے بیٹھے تھے۔ چولھے کے پرلی طرف ایک بوڑھا آدمی اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا جسم بہت دُبلا پتلا اور نحیف تھا ہڈیوں پر کھال کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی۔ دانت سارے کے سارے غائب تھے۔ اور چہرہ کپاس کے پھول ایسا زرد تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر بوڑھے سے مصافحہ کیا۔
"آپ نے اچھا کیا کہ واپس آ گئے" میں نے کہا۔
"چاچا جب گھر کے نزدیک پہنچا تو گدھّے سے اُتر گیا۔ اور کہنے لگا کہ پیدل چلوں گا۔" سینۃ مہل نے بڑی محبت سے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔
"آہو جی۔ میں دو سال سے گٹھیا کا مریض ہوں اور پیدل نہیں چل سکتا۔ لیکن جب یہاں پہنچا اور میں نے ٹاہلی کے یہ لمبے اونچے درخت دیکھے اور پگڈنڈی

کے گلاب دیکھے تو مجھے پرانے دن یاد آ گئے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میں پیدل چل سکتا ہوں ——— میں اس پگڈنڈی سے چالیس برس پہلے گذرا تھا اور اس کے بعد آج گذرا ہوں۔"

"جھلّوں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔" سینہ کی ماں نے شرارت سے کہا۔

"اس پگڈنڈی پر چلنے سے میری ٹانگوں میں طاقت آ گئی ہے۔ اور میں اپنے آپ کو پھر مضبوط محسوس کرنے لگا ہوں ——— اور یہ جو تمہارے سامنے رانی بیٹھی ہے نا یہ مجھ سے زیادہ جھلّی ہے۔"

"تجھ سے زیادہ جھلّا خدا کسی کو نہ بنائے۔" سینہ کی ماں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میں نے اس چھوٹی سی دنیا میں آج پہلی بار کسی کے ہونٹوں پر سینہ کی ماں کا اصلی نام اُبھرتے دیکھا تھا۔

رانی کی بوڑھی آنکھوں میں ایک شرارت بھری مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور شانو اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتا رہا۔ جن میں کھوئی ہوئی یادوں کا سارا نور سمٹ آیا تھا ——— ان کی طرف دیکھنا مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا جیسے میں ان کی تنہائیوں میں مخل ہو رہا ہوں ——— وہ دو بوڑھی روحیں جنھوں نے کئی برس کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ جو بچھڑ گئی تھیں اور آج اپنے بیٹوں، بھتیجوں، نواسوں اور پوتوں کے درمیان گذری ہوئی محبتوں کا جشن منا رہی تھیں ——— اور میں سوچ رہا تھا کہ بوڑھے شانو نے کیا محسوس

کیا ہو گا۔ جب اتنے طویل عرصے کے بعد اس نے رانی کو دیکھا ہو گا ـــــ رانی جس کے لئے وہ اپنے باپ دادا کی یہ چھوٹی سی دنیا چھوڑ گیا۔ اپنے قانونی ورثے سے دستبردار ہو گیا۔ اور مدّتوں جلاوطنی کی کٹھن زندگی بسر کرتا رہا۔

"شانو بابا آپ نے پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کی ہ؟"۔ میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"نہیں میرے بچے۔ لالی کی موت سے مجھے یقین ہو گیا۔ کہ ہر عورت بے وفا ہوتی ہے اور اگر اس سے محبّت کی جائے تو ساتھ چھوڑ جاتی ہے"۔ اُس کی آواز غمگین تھی۔ اور کانپ رہی تھی۔ جیسے کوئی اُداس سُر ساز کے تاروں پہ تھرتھرانے لگے۔

"یہ اس کی شروع سے عادت ہے۔ ہمیشہ اُلٹی سیدھی ہانکا کرتا ہے"۔ سیتہ کی ماں نے شوخی سے کہا۔

شانو مسکرا اٹھا۔ اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسوڑھے پیٹنے لگا۔

اس کے بعد اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ اور سیتہ کی ماں ہمارے لئے باجرے کی روٹی، سرسوں کا ساگ اور نمکین لسی لینے چلی گئی۔

شانو نے مجھ سے بے تحاشا باتیں کیں۔ وہ مجھے اپنی جلاوطنی کے قصّے سناتا رہا۔ اُس نے مجھے ستلج کے کنارے آباد بستیوں کے بارے میں بتایا اور ان پھولوں کے بارے میں جو صحرائے مردٹ میں سورج کی آگ اور ریت کی تپش

سے بغاوت کر کے اُگتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ملتے کے علاقے کے چرواہے بڑے نیک دل ہوتے ہیں۔ اور بھیڑوں کی اُون بیچ کر گذارہ کرتے ہیں۔ اس نے مجھے خانہ بدوشوں کی کئی کہانیاں سُنائیں۔ اور جب کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں جانے لگا تو اس نے نہر کے کنارے مجھے الوداع کرتے ہوئے کہا۔

"لڑکے تیری عینک بہت خوبصورت ہے۔۔۔ اور تجھے کہانیاں سننے کا بہت شوق ہے۔ کل پھر آجانا میں تجھے اور کئی کہانیاں سناؤں گا۔ میرے سینے میں کہانیوں کا خزانہ ہے۔"

مجھے شانو کی شخصیت نے بہت متاثر کیا تھا میں نے دوبارہ آنے کا وعدہ کر لیا۔

دوسرے دن میں ایک کام کی وجہ سے ان کے ہاں نہ جا سکا۔

تیسرے دن میں ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اس چھوٹی سی دُنیا کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیپ کو نہر کی پگڈنڈی پر چھوڑ کر جب میں پگڈنڈی سے گذرا تو میں نے دیکھا کہ رانی سفید گلاب کے پھول چن چُن کر اپنی جھولی میں بھر رہی ہے اور کھیتوں کے چاروں طرف شیشم کے درخت بڑی افسردگی سے اپنی ٹہنیاں جھکائے کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بڑھیا میرے پاس آگئی۔ اس کی جھولی سفید گلابوں سے اَٹی ہوئی تھی۔

"کہو اماں، شانو بابا کا کیا حال ہے ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" میں نے بڑی

زندہ دلی سے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ بکھر جائے گی۔ اور وہ اپنے مخصوص انداز میں کہے گی۔ آہو ٹھیک ٹھاک ہے پر ہے جھلاّ۔

لیکن میں سُن ہو کر رہ گیا جب اس نے کہا۔ "ہاں بچے جھلّی باتیں کرنا اس کی ساری عمر سے عادت تھی۔ پر آج جو بات کی ہے وہ ساری عمر نہ کی تھی۔" اس کی آواز میں آنسو تھے۔

"کیوں کیا ہوا ؟"۔ میں سمجھا کہ شانو پھر کہیں نکل گیا ہے۔

"آج جب اس کی بیٹی منظوراں اسے جگانے گئی تو وہ اپنے بستر پر مُردہ پڑا تھا"

"تو کیا شانو بابا مر گیا ؟"۔ میں چیخ اٹھا۔

"مر ہی گیا بچے۔ جھلاّ تو وہ ساری عمر کا تھا"

رانی نے سفید گلاب کا ایک پھول توڑا۔ اور اسے اپنی نحیف بوڑھی انگلیوں میں تھام کر سونگھنے لگی۔

"خیر موت تو بر حق ہے"۔ اس کے آنسو سفید گلاب پر شبنم بن کر گر رہے تھے۔ "مجھے خوشی ہے کہ وہ اپنی جگہ آ کر مرا ——— جب میں نے سیتہ کے باپ سے شادی کی تھی اور شانو یہاں سے چلا گیا تھا تو مجھے خیال آیا ——— اور اب بھی یہ خیال آتا ہے ——— کیا میں نے جانو سے شادی

کہ کے غلطی تو نہیں کی تھی؟"

میں مکان میں داخل ہوا تو کچے صحن میں کیکر کے سائے تلے تانو بابا کفن میں لپٹا پڑا تھا۔ اور میرے اردگرد پھیلی ہوئی وہ چھوٹی سی دُنیا کچھ پشیمان سی دکھائی پڑ رہی تھی؛

# تنکے اور طوفان

اس شام ٹیلیفون کی گھنٹی ساڑھے چھ بجے ٹنٹنائی ..... دسمبر کا مہینہ تھا اور جب اسد نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو دھندلکے گہرے ہو رہے تھے۔

"ہیلو۔"

"ہیلو ..... اسد؟"

"ارے یہ تم ہو مختار؟"

"ہاں ...... یہ بتاؤ، تمھاری بیوی گھر میں ہی ہے؟"

"بالکل ..... لیکن بات کیا ہے؟"

"اب کیا بات ہو سکتی ہے ..... ڈیم اِٹ"

اسد نے ریسیور اپنے منہ کے اور زیادہ قریب کر لیا اور سرگوشی کے

انداز میں پوچھا۔

"بھئی بتاؤ تو ..... معلوم ہوتا ہے کوئی خاص پروگرام ہے۔"

"خاص پروگرام یہی ہے کہ میں چاہتا ہوں، یہ رات تم میرے ہاں گذارو۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن آج رات میں نے شبّیر اور اس کی بیوی کو تاشش کھیلنے کے لئے مدعو کر رکھا ہے۔"

"بہرحال اگر تم یہ رات میرے ساتھ گذار سکتے ..... اچھا خیر تمہاری بیوی کب جا رہی ہے؟"

"غالباً اگلے ہفتے۔" اسد نے جواب دیا۔ "وہ کم از کم آٹھ دس دن تک بھاولپور رہے گی۔ اس کی والدہ بیمار ہیں۔ اس کے جانے کے بعد ایک رات نہیں آٹھ دس راتیں تمھارے ہاں گذریں گی۔"

"کاش تم آج رات آ سکتے۔"

"بھئی دل تو یہی چاہتا ہے کہ ابھی تمھارے پاس پہنچ جاؤں۔ مگر جو شبّیر وغیرہ کا ٹنٹا ہے نا..... مجھے پہلے معلوم ہوتا تو یہ پروگرام کل کے لئے اٹھا رکھتا.... اب تمھیں پتہ ہے کہ گھر سے ایک قدم بھی باہر نکالا تو بیوی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جائے گی۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کاش......"

"آخر بات کیا ہے مختار، وہی ہواؤں اور طوفانوں وغیرہ کا قصّہ تو نہیں؟"

دوسری طرف سے آنے والی آواز ایک لحظے کے لئے رُکی، جھجکی اور پھر ــــــ'

"ہاں ..... ہاں وہی ہَوا اور طوفان۔"

"لیکن آسمان تو بالکل صاف ہے اور کسی طوفان کے آثار نہیں اور ہَوا میں قطعاً کوئی تیزی نہیں۔"

"نہیں خاصی تیز ہَوا ہے ...... اس وقت یہ دریچے کی راہ سے اندر آ رہی ہے اور کمرے کے تمام پردوں کو جنبش دے رہی ہے جیسے مجھ سے اپنا وجود تسلیم کروانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"اچھا تو یوں کرو تم میرے ہاں آ جاؤ۔" اسد نے روشن روشن کمرے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ ..... نہیں بھئی ...... اب بہت دیر ہو چکی ہے ... ممکن ہے یہ مجھے راہ میں ہی دبوچ لے۔ فاصلہ بھی کم بخت کم نہیں ..... میں اس وقت تیس میل لمبی سیر کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں ..... بہرحال تمھارا بہت بہت شکریہ۔"

"اچھا تو نیند کی گولیاں کھاؤ اور سو جاؤ۔"

"اسد، سنو، میں آدھے گھنٹے تک دروازے میں کھڑا رہا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ آسمان کے غربی گوشوں میں یہ اپنی تمام طوفانی قوتیں جمع کر رہی

ہے۔ فی الحال چھ بادلوں نے اس کی راہ روک رکھی ہے۔ لیکن یہ بادل پھٹ جائیں گے۔ اس آخری قلعے میں بھی شگاف پڑ جائے گا۔ اور وہ آجائے گا۔ ..... اس وقت اس کی خشمگیں رفتار کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

"خیر ہٹاؤ ممّا اب تم نیند کی گولیاں نگلو اور آرام سے سو جاؤ۔ ضرورت پڑے تو پھر فون کر لینا۔"

"چاہے کسی بھی وقت؟" دوسری طرف کی آواز نے پوچھا۔

"یقیناً...... جب بھی چاہو۔"

"اچھا تو ٹھیک ہے..... لیکن اگر تم آسکتے تو بہت اچھا ہوتا.... بہرحال میں تمھیں بور نہیں کرنا چاہتا..... تم میرے بہترین دوست ہو ..... تمھیں کانٹا بھی چبھے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے اور پھر شاید قدرت بھی یہ چاہتی ہے کہ اس کا مقابلہ میں اکیلا ہی کروں..... مجھے افسوس ہے کہ تمھیں پریشان کر رہا ہوں۔"

"پاگل ہوئے ہو کیا۔ دوست اگر ایک دوسرے کے لیے پریشان نہ ہو سکیں تو دوستی کس کام کی..... بہرحال سونے کی کوشش کرو۔ اگر نیند نہیں آتی اور نیند کی گولیاں بھی کھانے کے لیے تم تیار نہیں تو یوں کرو کہ کچھ لکھ ڈالو۔" اسد نے بیٹھے بیٹھے اپنا بوجھ دوسرے کولھے پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرح تم ہمالیائی پہاڑیاں، مروٹ کے صحرا اور افریقہ کے ویرانے

بھول جاؤ گے اور یہ جو تمہارے ذہن پر تیز ہواؤں اور بادو باراں کے طوفان کی دہشت طاری ہے، یہ ختم ہو جائے گی۔ اگر تم لکھنے بیٹھ جاؤ تو آج رات تم اپنے سفر نامے کا ایک اور باب مکمل کر سکتے ہو۔"

"ہاں میں ایک اور باب مکمل کر سکتا ہوں۔ اور مکمل کر بھی لوں گا۔ یا شاید مکمل نہ کر سکوں..... ایک سطر بھی نہ لکھ سکوں...... بہر حال شکریہ۔"

"تمہاری اور تمہارے شکریے کی ایسی تیسی..... یہ تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو..... چلو اب اچھے بچوں کی طرح لکھنے بیٹھ جاؤ۔ مجھے میری بیوی، کھانے کی میز پر بیٹھی، آوازیں دے رہی ہے۔ خدا حافظ۔"

اسد نے ریسیور کریڈل میں رکھ دیا اور اُٹھ کر کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔

وہ کرسی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اس کی آنکھیں دور انجانے خلاؤں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ اس کی بیوی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"مختار کا فون تھا؟" بیوی نے پوچھا

اسد نے لب ہلائے بغیر، اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مختار اور اس کی ہوائیں اور اس کے طوفان... بھئی میں تو اس کی ہواؤں اور طوفانوں سے تنگ آ چکی ہوں۔"

"اُس نے ان علاقوں کی سیاحت کی ہے، جہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں اور

طوفان آتے ہیں۔"

"لیکن یہ تم مرد ایسے علاقوں میں جاتے ہی کیوں ہو؟"۔

"جب کسی کو نگری نگری پھرنے کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ گھر کا راستہ بھول جاتا ہے۔"

ہمالیائی پہاڑیاں، مروٹ کے صحرا، افریقہ کے ویرانے، یہ سب ایسی جگہیں ہیں جہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں طوفان اُمڈتے ہیں .... یہ مجھے مختار نے بتایا تھا..... ان جگہوں پر تمام دُنیا کے طوفان، ساری کائنات کی ہوائیں اکٹھی ہو جاتی ہیں"۔ اسد نے روٹی کا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی مجھے مختار نے بتایا تھا۔"

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسے ان جگہوں پر جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔" بیوی نے کہا۔ "جب آپ دُنیا کے تمام ڈھکے، چھپے کونے کھدروں میں ناک گھسیڑتے پھریں گے تو پہلی چیز جو ہو گی وہ یہ کہ عجیب عجیب قسم کے کامپلکس ذہن میں گھُسیں گے .... ہوائیں آپ سے ناراض ہو جائیں گی .... طوفان پیچھا کریں گے ..... لاحول ولا ....."

"خدا کے لئے نزہت اس کا مذاق نہ اڑاؤ .... وہ میرا بہترین دوست ہے۔" اسد نے اس کی بات اُچک لی۔

"یہ سب اعلیٰ درجے کی بے وقوفی ہے۔"

"تاہم اس نے کئی طوفانوں کا سامنا کیا ہے..... صحرائے مردث میں صرصر کی تندی، مشرقی پاکستان کے سائیکلون، بحرالکاہل کے جزیروں میں طوفان بادوباراں، افریقہ کے ویرانے اور وہاں کی تیز ہوائیں، جو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہیں، ہمالیائی پہاڑیوں کی وادیاں جہاں برف کے طوفان چنگھاڑتے ہیں۔"

"مجھے ایسے آدمی سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی جو جان بوجھ کر دنیا کے ان خطوں میں جاتا رہا ہے، جہاں چنگھاڑتے ہوئے طوفان ہیں، بادوباراں کے جھکڑ ہیں اور پھر وہاں سے ہواؤں اور طوفانوں کا ایک اذیت رساں کامپلکس لے کر لوٹتا ہے۔"

معاً ٹیلیفون کی گھنٹی پھر ٹنٹنائی۔

"اس کا جواب مت دو۔" بیوی نے خشمگیں انداز میں کہا۔

"ممکن ہے کوئی اور ہو اور کسی اہم معاملے پر گفتگو کرنا چاہتا ہو۔"

"نہیں یہ مختار کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔"

وہ خاموش بیٹھے رہے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی کئی بار ٹنٹنائی اور انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر گھنٹی خاموش ہو گئی..... انھوں نے کھانا ختم کیا اور جب وہ ڈرائنگ روم میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک آدھ کھلے دریچے میں سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اندر داخل ہو کر پردوں کو جنبش دے رہے تھے۔

ٹیلیفون پھر ٹنٹنایا۔

"بھئی اب میں جواب دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اسد نے کہا اور ریسیور اٹھالیا۔ "ہیلو..... مختار۔"

"اسد وہ آگئی ہے..... یہاں پہنچ گئی ہے۔"

"بھئی ریسیور سے ذرا منہ ہٹا کر بولو..... تمھاری آواز پھٹ رہی ہے۔"

"میں کھلے دروازے میں کھڑا رہا اور اس کا انتظار کرتا رہا۔ میں نے اسے دریا کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا..... وہ ایک ایک کرکے راستے کے تمام درختوں کو جھنجھوڑتی ہوئی آرہی تھی۔ اور آخر وہ یہاں پہنچ گئی۔ اس نے غوطہ کھاکر دروازے میں سے اندر داخل ہونے کی کوشش کی لیکن میں نے دروازے کے پٹ اس کے منہ پر دے مارے..... بند کر دیئے۔"

اسد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی بیوی اس کے سر پر کھڑی تھی، اور اسے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ "پھر کیا ہوا؟" اس نے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے پوچھا۔

"وہ مکان کے چاروں طرف پھیل گئی ہے اسد، اس نے میرا محاصرہ کرلیا ہے۔ میں اب باہر نہیں نکل سکتا۔ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ میں بالکل بے بس ہوگیا ہوں۔ لیکن میں نے اسے بیوقوف بنایا ہے۔ اسے جل دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے مجھ پر قبضہ کرلیا ہے۔ مگر جونہی اس نے میرے

منہ کو چھوا، میں نے دروازہ بند کر لیا.... میں اس کے حملے کے لیے تیار تھا...... ہفتوں سے تیار تھا"

"ارے اب بھی تیار ہو یا نہیں —؟" اسد نے بڑے خوشگوار موڈ میں پوچھا۔ اس کی بیوی نے اس کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور اس کی گردن پر پسینہ آنے لگا۔

"یہ سلسلہ چھ ہفتوں سے شروع تھا۔ اور......"

"ہاں۔ ہاں کہو"

"میرا خیال تھا کہ اس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ مجھ پر قبضہ کرنے کی کوشش ترک کر دی ہے۔ لیکن یہ سب غلط تھا۔ وہ اپنی قوتیں جمع کر رہی تھی۔ اور چھ ہفتے پہلے کی بات ہے کہ میں نے اُسے اپنے گھر کے گوشوں میں ہنستے ہوئے، سرگوشیاں کرتے ہوئے سُنا...... جیسے وہ میرے خلاف سازش کر رہی ہو"

"بات تو خوب کہی یار" اسد نے ریسیور کے سامنے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"میری بات کو مذاق مت سمجھو۔ اور گذشتہ رات وہ دوبارہ آ گئی۔ اس نے دروازوں اور کھڑکیوں کے پٹ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ آتشدان میں سے چنگاریاں اڑائیں۔ پردوں کو پھڑپھڑایا۔ وہ مسلسل چھ راتوں

تک آتی رہی اور ہر بار ایک نئی قوت کے ساتھ آئی۔ ایک دن میں دروازے میں کھڑا تھا کہ اس نے مجھے باہر دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس دن یہ اتنی طاقتور نہیں تھی، جتنی آج ہے۔"

"چلو اچھا ہوا کہ تم اپنے کو بہتر محسوس کر رہے ہو۔"

"میں ہرگز بہتر نہیں محسوس کر رہا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میری تو جان پہ بنی ہے اور تم ..... کہیں تمھاری بیوی تو تمھارے پاس نہیں کھڑی ہے؟"۔

"ہاں۔"

"وہ شاید مجھے پاگل سمجھتی ہے۔"

"نہیں۔ نہیں، تم بات کرو۔"

اس اثنا میں اسد کی بیوی باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسد نے سکھ کا سانس لیا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ "کہے جاؤ مختار۔ اپنا سارا غبار نکال ڈالو۔ اس طرح تمھیں شاید نیند آجائے"۔

"یہ اس وقت میرے مکان کے چاروں طرف سانپ کی طرح پھنکار رہی ہے اور درختوں کو جھنجوڑ رہی ہے۔"

"لیکن یار، یہاں ہارون آباد میں تو ہوا اتنی تیز نہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ہارون آباد میں واقعی تیز نہیں ہو گی۔ یہ تو صرف وہاں ہوتی ہے، جہاں میں ہوتا ہوں۔"

"ہاں، بات کی تشریح کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔"
"نہیں بھئی میں کوئی تشریح وغیرہ نہیں کر رہا۔۔۔۔ یہ قاتل ہے اسد، قاتل۔۔۔۔۔۔ ایسا قاتل آج تک کوئی نہیں ہوا۔ یہ قتل بھی اس طرح کرتی ہے کہ لوگ مقتول کو زندہ سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ اور جس کو اس نے قتل کرنا ہوتا ہے، اس کی بُو سونگھتی پھرتی ہے۔ آج یہ میری بُو سونگھتی پھر رہی ہے۔ میں کسی بھی کمرے میں چھپنے کی کوشش کروں، یہ وہیں آجاتی ہے۔ اس نے میرے مکان کی تمام روشنیاں بجھا دی ہیں۔ بجلی کے تمام تار کاٹ دیئے ہیں۔ اب شاید ٹیلیفون کے تار کی باری ہے۔۔۔۔۔ اور یہ آواز سنتے ہو؟"

اور اسد نے سُنا، جیسے دوسری طرف کوئی سائرن بج رہا ہو۔۔۔۔ مختار چیخ رہا تھا،

"ارے اسد، سُنتے ہو؟"

"اسد نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں، سُن رہا ہوں۔"

"یہ وہی طوفان ہے جو مردٹ کے صحرا میں آیا تھا، جو ہمالیہ کے دامن میں گرمجا تھا، جس نے مشرقی پاکستان میں کئی زندگیوں کا موت سے سودا کیا تھا، جو افریقہ کے ویرانوں میں چنگھاڑا تھا اور جس نے جزیرہ ہوائی کے ساحلوں پر تباہی مچائی تھی۔۔۔۔۔۔ یہ وہی طوفان ہے۔۔۔۔ میں ہر جگہ اس کے چنگل سے بچتا آیا ہوں اور یہ میرے تعاقب میں رہا ہے، تاکہ یہ

مجھے مار دے۔ مبادا میں دنیا کو وہ سب کچھ بتا دوں جو اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے...... مجھے اس کے مرکز کا علم ہے، جہاں بیٹھ کر یہ زندگی کی تباہی کے منصوبے بناتا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے کہاں جنم لیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کونسی قوت ہے جس نے اس کی تخریب کا رُخ انسانی زندگی کی طرف موڑا...... اس لئے یہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ میں نے اس کے خلاف کتابیں لکھی ہیں اور انسان کو اسے شکست دینے کے گُر بتائے ہیں...... یہ مجھے ایک ایسا جسم بنانا چاہتا ہے، جس کا دماغ چھین لیا گیا ہو۔ جو اس کے خلاف بغاوت نہ کر سکے۔"

"اچھا بھئی، اب میں فون بند کرتا ہوں۔ میری بیوی......"

"کیا؟"۔

ایک مختصر سا وقفہ...... دوسری طرف سے آتی ہوئی تیز ہواؤں کی پھنکار...... اور اس پھنکار کے عقب میں مختار کی چیختی ہوئی آواز۔

"تم نے کیا کہا تھا اسد؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ میری بیوی مجھے بُلا رہی ہے...... شاید وہ لوگ آگئے ہیں...... تم مجھے پھر فون کرنا۔"

اور اسد نے فون بند کر دیا۔

باورچی خانے سے اس کی بیوی اب تک اسے پُکار رہی تھی......

وہ لوگ شاید نہیں آئے تھے..... وہ سیدھا باورچی خانے میں چلا گیا،
..... وہاں اس کی بیوی، ٹرالی میں کافی کے برتن اور سینڈوچز سجا رہی
تھی.... اسد کے قدموں کی چاپ سُن کر اُس نے سر اٹھایا اور دیکھا کہ اسد
کی آنکھوں میں فکرمندی ناچ رہی ہے۔

"باہر رات کا کیا عالم ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"بہت خوبصورت رات ہے..... ہلکی، ہلکی ہوا چل رہی ہے اور
آسمان پر ستارے ہیں۔" بیوی نے پلیٹ میں ایک سینڈوچ کو ٹھیک سے
جماتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیوں.... تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، بس یونہی۔"

اِس اثنا میں فون کی گھنٹی تین بار ٹنٹنائی۔ اور رات کے تقریباً آٹھ بجے
وہ لوگ آگئے..... شبیر اور اس کی بیوی..... خاصی دیر تک وہ
ڈرائنگ روم میں بیٹھے کافی پیتے رہے، سینڈوچز کھاتے رہے اور باتیں
کرتے رہے۔ اور پھر رمی کی بازی شروع ہو گئی۔

اسد تاش کے پتوں کو بار بار پھینٹتا تھا، بار بار سگریٹ سلگاتا تھا اور
بار بار سر اٹھا کر، مکان سے باہر، کچھ سننے کی کوشش کرتا تھا.... لیکن
وہاں کوئی آواز نہ تھی..... ایک دفعہ تو وہ اپنی باری پر پتہ پھینکنا بھول
گیا..... اس کی بیوی نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ سنبھل گیا۔

وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگا رہا تھا اور وہ سب، قہقہوں کے درمیان دنیا جہان کی باتیں کر رہے تھے۔ سامنے والی دیوار پر کلاک نے نو بجائے اور اسد نے ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا:

"ہم سب یہاں موجود ہیں.... اور زندگی بے حد رنگا رنگ ہے۔"

"ہوں؟" ___ شبیر نے کہا۔

"کچھ نہیں.... میرا مطلب تھا کہ ہم سب یہاں موجود ہیں.... اپنی اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں..... اور یہاں سے دُور، زمین کے کسی اور خطے میں بھی، کروڑوں لوگ اپنی اپنی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔"

"ہاں، تو اس میں خاص بات کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے، تاہم....." اس نے سگریٹ کو دوبارہ اپنے ہونٹوں میں بھینچ لیا۔ "زندگی بہت اکیلی ہے..... کسی بھٹکے ہوئے پرندے کی طرح تنہا.... ہم شادیاں کرتے ہیں اور پھر بھی اکیلے رہتے ہیں۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ہم کسی کے بازوؤں میں، کسی کی زلفوں کی چھاؤں میں ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارا دل ہزاروں میل دور کہیں اور بھٹکتا ہے۔"

"جی ہاں، یہ منافقت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔" اس کی بیوی نے خشمگیں لہجے میں کہا۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔" اس نے کسی احساسِ جرم کے بغیر،

پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "میرا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنے اعتقادات پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اپنے انداز کے مطابق اپنی زندگیوں کے چھوٹے چھوٹے وقفے گذارتے ہیں۔ جبکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جن کے اعتقادات اور زندگیاں گذارنے کے انداز ہم سے بالکل مختلف ہیں.... مثال کے طور پر ہم یہاں، اس کمرے میں، بیٹھے ہیں اور ہزاروں انسان ایسے بھی ہیں، جو اس وقت مر رہے ہیں.... کچھ کو سرطان ہو گیا ہے، چند نمونیے کا شکار ہیں اور کچھ دق کے مریض ہیں.... میرے اندر کی آنکھوں نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ لاہور سے راولپنڈی جانے والی بس اُلٹ گئی ہے اور کئی بے قصور، معصوم جانیں تلف ہو گئی ہیں۔"

"بھئی اس وقت ہم تاش کھیل رہے ہیں۔ یہ ناقابلِ فہم فلسفہ کسی اور وقت بھی بیان ہو سکتا ہے"۔ اس کی بیوی نے اُکتاتے ہوئے کہا۔

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہم سب زندہ ہیں، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ دوسرے انسان کیسے زندہ رہتے ہیں، کیا سوچتے ہیں اور کیوں مر جاتے ہیں... ہمیں صرف موت کا انتظار کرنا آتا ہے... اب ہم اپنی طاقت ور ہڈیوں اور اپنے گرم خون کی گردش کے سہارے یہاں بیٹھے اور عین اس وقت یہاں سے تیس میل دور، بھاولنگر کے ایک بڑے سے پرانے مکان کا طوفانی ہواؤں نے محاصرہ کر رکھا ہے اور اس مکان میں رہنے والا ایک ذہین ترین لڑکا...."

"خدا کے لئے اسد۔ اس کی بیوی نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی۔

اسد نے سگریٹ کا ایک بھرپور کش لگایا اور خالی خالی نظروں سے، اپنی انگلیوں میں تھامے ہوئے پتوں کو دیکھنے لگا۔

"تمھاری باری ہے۔" شبیر نے اسے بھاری آواز میں مطلع کیا۔

رمی چلتی رہی ..... تاش کے پتے پھڑپھڑاتے رہے اور مختلف وقفوں کے بعد قہقہے ابھرتے رہے .... اسد صوفے میں گہرا دھنس گیا اور بیمار سا دکھائی دینے لگا۔

معاً ٹیلیفون کی گھنٹی ٹنٹنائی ...... اسد نے اچھل کر ریسیور اٹھا لیا۔

"مختار، تم خیریت سے ہو نا؟"

"ہاں .... تمہاری خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب .... میں اس وقت باورچی خانے میں قید ہوں۔ میرے گھر کی سامنے والی دیوار گر چکی ہے۔ ڈرائنگ روم کی چھت اڑ گئی ہے۔ لیکن میں نے اپنے بچاؤ کا تھوڑا بہت انتظام کر لیا ہے .... باورچی خانے کی دیوار بھی گر گئی تو میں گیلری میں چلا جاؤں گا۔ اس کی چھت اڑ گئی تو کسی اور کمرے میں پناہ لے لوں گا۔ اس طرح شاید میں صبح تک زندہ رہ سکوں ..... یہ طوفانی ہوا مجھے آسانی سے موت کے گھاٹ نہیں اتار سکے گی۔ مجھے مارنے کے لئے اسے یہ سارا مکان گرانا پڑے گا۔"

ٹیلیفون کی دوسری طرف سے اسد کو کئی انسانوں کی آوازیں سنائی دیں

.... وہ لوگ واویلا کر رہے تھے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" اسد نے خوف سے لرزتے ہوئے پوچھا۔ "انھیں کیا ہو گیا ہے۔"

"یہ لوگ۔" مختار نے ایک ہلکے قہقہے کے ساتھ جواب دیا۔ "تم نہیں جانتے انھیں؟ - یہ وہ لوگ ہیں جو موت کے صحرا میں صرصر کے طوفانوں کا شکار ہوئے، جنھیں مشرقی پاکستان میں سائیکلون نے لقمہ اجل بنایا، جو مراکش میں طوفان بادوباراں کے ہاتھوں موت کی نذر ہو گئے ...... یہ انھیں لوگوں کی چیخیں ہیں .... ان طوفانوں نے انھیں موت کی نیند سلا دیا۔ ان سے ان کی ذہانت اور ان کی روحیں چھین لیں تاکہ یہ ان طوفانوں کا مقابلہ نہ کر سکیں ..... یہ کہانی تو صدیوں تک پھیلی ہوئی ہے اسد، کہاں تک سنو گے؟"

ٹیلیفون میں عجیب وغریب قسم کی آوازیں آنے لگیں، جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسد چلّایا:

"مختار اگر تمھیں مدد کی ضرورت ہے تو میں ابھی بھاولنگر آتا ہوں۔"

"بھئی ڈیگیم یونہی پڑی ہے اور تم فون سے چمٹے ہوئے ہو۔" اس کی بیوی چلائی۔

"خدا کے لئے چپ رہو۔" اسد نے سختی سے کہا۔ اور پھر فون میں منہ دے کر چلانے لگا۔ "بھئی جواب دو مختار، میں بھاولنگر آؤں؟"

"نہیں"۔ دوسری طرف سے مدھم سی آواز آئی۔ "یہ بغض، اہانت اور تعصب کی جنگ ہے۔ اس میں تمہاری شرکت میں پسند نہیں کرتا..... اچھا اب میں فون بند کرتا ہوں۔ باورچی خانے کی دیواریں لرز رہی ہیں۔ اب شاید مجھے گیلری میں جانا پڑے گا۔"

"مجھے پھر فون کرنا۔ میں فکرمند رہوں گا۔"

اور وہ کھیل کی طرف لوٹ آیا..... رمی پھر شروع ہو گئی..... وہ بڑبڑاتا رہا۔

"مجھے بہاولنگر جانا چاہیئے تھا..... مختار کو مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا اُسے۔ پھر دورہ پڑا ہے؟"۔ بیوی نے پوچھا۔

"ہاں، کل میں پہلا کام یہ کروں گا کہ بہاولنگر جاکر مختار کو ہسپتال میں داخل کراؤں گا..... وہ بہت اپ سٹ ہو گیا ہے۔"

وہ کافی پی رہے تھے اور کھیل رہے تھے..... یکایک اسد اٹھا اور فون پر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ساری سر"، آپریٹر نے کہا۔ "بہاول نگر اس وقت شدید طوفان کی لپیٹ میں ہے۔ ٹیلیفون کی تاریں ٹوٹ چکی ہیں۔"

"تو کیا اس بار یہ دورہ نہیں تھا؟..... مختار ٹھیک کہتا تھا..... ٹیلیفون کی باری بھی آگئی..... بہاول نگر شدید طوفان کی لپیٹ میں ہے۔"

اسد ریسیور کو کریڈل میں پھینک کر پاگلوں کی طرح چلّانے لگا۔ اس کی بیوی اور مہمانوں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ جلدی جلدی اوور کوٹ پہن رہا تھا۔

بھئی معاف کرنا اس نے حیران و پریشان مہمانوں سے کہا۔ "میں بھاولنگر جا رہا ہوں۔" اور جب اس نے اوور کوٹ پہن لیا تو دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہوئی۔ . . . کمرے میں موجود، ہر شخص خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کون ہو سکتا ہے اس وقت؟" اس کی بیوی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

دستک دوبارہ ہوئی . . . مگر ویسی ہی، ہلکی ہلکی، مدّھم، مدھم۔

اسد وہیں کا وہیں کھڑا تھا، جیسے جم کر رہ گیا ہو۔

معاً باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی آہستہ آہستہ سرگوشی میں ہنس رہا ہو۔

اسد جلدی جلدی دروازے کی چٹخنی کھولنے لگا۔

"میں نے پہچان لیا . . . یہ مختار کی ہنسی ہے . . . وہ آخر کار طوفان سے بچ آیا ہے۔ شاید اس کے ساتھ چند اور لوگ بھی ہیں۔ اُن کی باتوں کی آواز آ رہی ہے۔"

اسد نے دروازہ کھول دیا۔

برآمدہ بالکل خالی تھا۔

لیکن اسد کے چہرے پر شرارت ناچنے لگی،

"مختار بھئی اب بور نہ کرو۔۔۔ آخر کب تک چھپے رہو گے"۔ اس نے برآمدے کا بلب روشن کر دیا۔ "کہاں ہو بھئی تم۔۔۔۔ چلو یار، چھوڑو یہ مذاق۔۔۔۔ بہت سردی ہے۔۔۔۔ کچھ دیر اور چھپے رہے تو قلفی جم جائے گی"۔ سرد ہوا کا ایک چھوٹا سا جھونکا آیا اور اسد کے چہرے سے ٹکرا کر گذر گیا۔

اسد نے چند لحظوں تک انتظار کیا اور پھر برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر بڑے غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور اس کے بال بکھیر گیا۔

اُسے ایک بار پھر دبی، دبی ہنسی کی آواز سنائی دی۔۔۔۔ ہوا معاً تیز ہو گئی۔ اس کا سانس رُکنے لگا۔ کئی طوفانی لمحے اس کے اوپر سے تیرتے ہوئے گذر گئے۔۔۔۔ ہوا درختوں کی شاخوں سے لپٹ کر زور زور سے بَین کرنے لگی۔۔۔۔ اور پھر اسے یوں لگا جیسے وہ واپس جا رہی ہو، طوفان معدوم ہو رہا ہو اور زندگی کی سانسیں تھم رہی ہوں۔

وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔۔۔۔ خاموش، منجمد، سرد۔۔۔۔ اور پھر وہ سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آ گیا اور ایک ستون سے لپٹ کر بچّوں کی طرح رونے لگا۔

"بھئی، کیا ہوا۔۔۔؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا...... اس کی مندی ہوئی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے..... ہولے، ہولے....... آہستہ، آہستہ....... قطرہ، قطرہ......،

# خشک جھیل اور لڑکی

ان چھ برسوں میں کوئی رات ایسی نہ گذری تھی، کہ سہیل کو وہ خواب نہ آیا ہو، اور کوئی دن ایسا نہ گذرا تھا کہ اُس نے اپنا وہ خواب مجھے پوُری تفصیلات کے ساتھ نہ سُنایا ہو۔ لیکن میں نے اس کے خواب کو کبھی کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ ہر شخص خواب دیکھتا ہے ... یہ خواب کبھی تو خوشگوار ہوتے ہیں اور کبھی اُداس .... ان خوابوں میں کبھی تو یوں ہوتا ہے۔ کہ زندگی ایک ستائے ہوئے پرندے کی طرح لاشعور کی اُلجھی ہوئی زنجیروں میں پھڑپھڑاتی رہتی ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ روشنی کے نرم نرم کنول مسکرا اُٹھتے ہیں۔ ہر ساعت کی لویں نیم باز ہو جاتی ہیں، اور زندگی کی زلفیں دراز ہو کر پھولوں پر بکھر بکھر جاتی ہیں .... اس لئے میں نے خوابوں اور ان کی تعبیروں کے بارے میں کبھی اپنے کو پریشان نہیں کیا، اور نہ ان کے متعلق زیادہ

سوچنے کی ضرورت ہی محسوس کی۔۔۔۔ میں جو خواب دیکھتا ہوں وہ مجھے ایک دو دن تو یاد رہتے ہیں، پھر میرا حافظہ ان کو بھلا دیتا ہے۔۔۔ لیکن سہیل چھ برس سے ایک ہی خواب دیکھ رہا تھا، اور ان چھ برسوں میں اس خواب کے واقعات، مناظر اور کرداروں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔۔ وُہی سہیل، کھویا کھویا سا لڑکا جو بے حد خوب صورت کہانیاں لکھتا تھا اور بے تحاشا سگریٹ پیتا تھا۔۔۔۔ وہی گھٹاؤں کی رنگت ایسے بالوں اور موٹی موٹی بڑی آنکھوں والی سانولی لڑکی جو اس کو پکار کر غائب ہو جاتی تھی۔۔۔۔ وہی ندی، وُہی محرابی پُل اور وہی صحرا۔

جب گذشتہ موسم سرما میں سہیل اپنے گاؤں سے لاہور آیا تو میں نے اس کو ایک بوڑھے ماہر نفسیات کے پاس جانے کا مشورہ دیا، جو ایک مقامی کالج میں نفسیات کے شعبے کا سربراہ تھا اور ذہنی اختلال کے کئی مریضوں کو صحت یاب کر چکا تھا۔ مگر سہیل خواب کے تسلسل سے پریشان ہونے کے باوجود اپنے کو ذہنی اختلال کا مریض تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا، بہرحال میرے مجبور کرنے پر وہ بوڑھے ماہر نفسیات کے پاس چلا گیا۔ لیکن اس نے سہیل کے خواب کو صحیح خواب ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ فرائڈ نے خوابوں کا جو معیار مقرر کیا ہے، اس پر یہ خواب پورا نہیں اترتا۔ اس لئے یہ سرے سے کوئی خواب ہی نہیں ہے اور نہ یہ کسی ذہنی اختلال کا نتیجہ ہے، بلکہ محض معدے

کی خرابی ہے۔ اس نے سہیل سے کہا کہ وہ اپنے معدے کا علاج کرائے۔ اور اس بے تُکے خواب کے بارے میں سوچنا قطعی ترک کر دے۔ چونکہ جو خواب ہے وہ چھ برس تک مسلسل نہیں آسکتا.... شاید یہ بھی بوڑھے ماہر نفسیات کا کوئی نفسیاتی حربہ تھا۔ لیکن جب سہیل واپس آیا تو نفسیات پر سے اس کا یقین اُٹھ چکا تھا۔ وہ نہایت پریشانی کے عالم میں مجھ سے کہنے لگا:

"بوڑھا خود نفسیاتی مریض ہے..... وہ کہتا ہے کہ خواب کا مسلسل چھ برس تک آنا ناممکن ہے۔ حالاں کہ تم گواہ ہو کہ مجھے یہ خواب چھ برس سے مسلسل آرہا ہے، اور...... اور......" اُس کا دُبلا جسم کانپنے لگا۔ "آج رات مجھے پھر یہی خواب آیا تھا۔ میرا خیال ہے میں ساری عمر یہی خواب دیکھتا رہوں گا۔"

وہ نومبر کے آخری دن تھے۔ زمستانی ہواؤں میں خنجر کی سی کاٹ تھی۔ اور صبحیں دُھند لائی تھیں..... اس نے مجھے ایک بار پھر اپنا خواب سُنایا..... وہی واقعات، وہی مناظر، وہی کردار،..... ایک ایک تفصیل وہی تھی..... چھ برس پہلے اور آج کے خواب میں کوئی فرق نہ تھا۔

دوسرے دن میں سہیل سے ملنے گیا..... وہ ماڈل ٹاؤن میں اپنے چچا کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا..... میں بس اسٹاپ پر اُترا تو ہر طرف دُھند چھائی ہوئی تھی۔ ماحول کچھ بوجھل بوجھل اور سوگوار سا تھا۔ جب میں اس کے

گھر پہونچا تو وہ لان میں آم کے ایک درخت سے ٹیک لگائے کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایک لٹ ماتھے پر جھول رہی تھی۔ لمبی لمبی حنائی انگلیوں میں سگریٹ سُلگ رہا تھا۔ اور کھوئی کھوئی سی آنکھیں کاغذوں پر جھکی ہوئی تھیں..... میں نے اس کے قریب جاکر ہولے سے اس کو پکارا۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی اُداس کلیاں بکھر گئیں۔

"آؤ بھئی، کہاں سے آئے ہو؟"۔

اس نے کاغذ سمیٹتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر میرے لئے کافی کا کہنے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر آیا تو اس نے نارنجی رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بہت سی ٹافیاں نکال کر میری طرف اُچھال دیں.....اُس نے اپنی مسکراہٹ کی اُداسی پر قابو پالیا تھا اور اس وقت اس کا موڈ بڑا خوشگوار تھا..... ہم اسی آم کے درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ وہ مجھے اپنی نئی کہانیوں کے خاکے سُنانے لگا..... معاً اس کے چہرے پر معصومیت کی روشنی پھیل گئی۔

"میں دو عظیم ناول لکھنا چاہتا ہوں۔" اُس نے بچّوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے مجھے اطلاع دی۔

"پھر میں کیا کروں ؟" ۔ میں نے شرارت سے پوچھا۔
"پھر" ۔ وہ کھو سا گیا۔ "پھر تم تو کچھ نہیں کرو گے لیکن میں خودکشی کر لوں گا"
"ہشت، اچھے لڑکے ایسی باتیں نہیں کرتے ۔"
"اگر اللہ میاں چاہتا ہے کہ میں دو عظیم ناول لکھنے کے بعد بھی زندہ رہوں تو اُسے میرے خواب کو حقیقت بنانا ہی ہو گا" اس کی موہوم آواز کہیں دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔
"وہ کیوں ؟" ۔ میں نے سوال کیا۔
"وہ اس لئے کہ دو عظیم ناول لکھنے کے بعد میرے پاس اس خواب کے علاوہ اور کچھ نہیں رہے گا۔ اور خواب بہر حال خواب ہے۔ جب تک تعبیر نہ مل جائے ..... میں صرف خوابوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا"
اتنے میں کافی آ گئی۔ وہ خاموشی سے میری پیالی میں کافی انڈیلنے لگا ....
یکایک اُس کے ہاتھ کانپنے لگے، اور ماتھے پہ پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں ..... ہونٹوں کی لرزش شدید ہو گئی اور آنکھیں دُور خلاؤں میں گڑ گئیں۔
"یار، تم خود کافی بنا لو" ۔ اس نے کافی پاٹ بڑی مشکل سے میز پہ رکھتے ہوئے کہا۔
میں کافی بنانے لگا۔ وہ نہ جانے کہاں کھو گیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ کہانیوں اور پھولوں سے پیار کرنے والا یہ پیارا سا لڑکا، اپنے خواب

میں اس قدر اُلجھ گیا ہے کہ خود ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔

وہ اسی طرح اُجڑا اُجڑا، کھویا کھویا بیٹھا تھا..... میں جانے کے لئے اٹھا تو وہ مجھے الوداع کہنے گیٹ تک بھی نہیں آیا..... شاید اُسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔

اس کے بعد وہ لاہور سے غائب ہو گیا۔ شاید اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔

اس کی حالت نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ اگر مجھے پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس قدر بے چین ہو جائے گا۔ اُس کی روح پہ یہ کچھ بیت جائے گی۔ اس کا خواب وہ درد بن جائے گا جو راتوں کے علاوہ دن کو بھی کسک اُٹھتا ہے۔ تو میں خوابوں پر یقین نہ رکھنے کے باوجود، خانقاہوں میں دیپ جلا جلا کر اُس کے خواب کی تعبیر مانگتا۔ وادی وادی، صحرا صحرا پھرتا..... شاید کسی پہاڑ کی کھوہ میں، کسی پھولوں کے کنج میں، کسی وادی کی گہرائی میں، کسی صحرا کی وسعت میں مجھے اس کے خواب کی تعبیر مل جاتی..... وہ میرا بہت ہی عزیز دوست تھا۔

بہر حال اب بھی میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا..... ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے..... لیکن میں چلا اٹھا۔ ..... ایسا نہیں ہو سکتا..... اتنی خوب صورت کہانیاں لکھنے والے لڑکے جن کے بال بکھرے رہتے ہیں، جن کے ہونٹ مسکراتے رہتے

ہیں، کبھی پاگل نہیں ہو سکتے..... میں اُس کو پاگل نہیں ہونے دوں گا.....
وہ پاگل نہیں ہو گا۔

ہم ایک دوسرے کو دس برس سے جانتے تھے۔ ایک بار میں اس کے گاؤں بھی گیا تھا۔ ٹاہلی اور شریہنہ کے درختوں میں چھپے ہوئے اس گاؤں میں نغمے ہی نغمے تھے۔ اور میں نے سوچا تھا کہ جس گاؤں میں صبا کا ہر جھونکا اپنے دامن میں خوشبوؤں کا طوفان لے کر آئے۔ جہاں ہر چراغ ستارہ بن کر روشن ہو، ہر بلول گیت بن کر اُبھرے، ہر پھوار شبنم بن کر بَرسے، ہر زلف گھٹا بن کر لہرائے وہاں اگر کوئی پچھوفت بن کر مہک اڑاتی، ہنستی مسکراتی کہانیاں نہ لکھے تو اور کیا کرے

ابھی دنوں کی بات ہے کہ گندم کے شاداب کھیتوں میں گھومتے سمے سہیل نے مجھے پہلی بار اپنا خواب سُنایا، اور بتایا کہ اسے متواتر تین راتوں سے یہ خواب آرہا ہے...... اور پھر یہ تین راتیں چھ برس بن کر پھیل گئیں۔

"یار، تین راتیں ہو گئی ہیں"۔ اس نے ایک نالے کے کنارے اُگی ہوئی گھاس پر بیٹھ کر گندم کے کھیتوں کو مندی مندی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پوری تین راتیں۔ اور یہ خواب میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"کوئی ڈراؤنا خواب ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں خواب تو بہت پیارا ہے، اگر یہ صرف خواب ہی ہو تو میں شاید اپنی زندگی کی ساری راتیں اس کی نذر کر دوں لیکن اس خواب میں جو زندگی کی طرح دھڑکتی ہوئی حقیقت ہے نا"۔۔۔۔ اور وہ خاموش ہو گیا۔

اور آج چھ سال ہو گئے ہیں، اسے زندگی کی طرح دھڑکتی ہوئی یہ حقیقت نہیں ملی۔

اُس نے ان چند برسوں میں جب بھی یہ خواب دیکھا تو یہی دیکھا کہ وہ اپنے گاؤں کے جنوب میں پھیلے ہوئے صحرا کی ایک تنہا پگڈنڈی پر چل رہا ہے۔ خزاں کا موسم ہے۔ درختوں کے پتے جھڑ گئے ہیں۔ اور جھاڑیاں سوکھ گئی ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ آسمان کی کیل سے لٹکا ہوا، چاند کا زرد فانوس، اپنی پھیکی پھیکی روشنی پورے صحرا میں بکھیر رہا ہے۔ ستاروں کے دیپک ایک ایک کر کے بجھتے جا رہے ہیں۔ اور وہ چلتے چلتے ایک ندی کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ ندی کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہے اور اس پر لکڑی کا ایک محرابی پُل ہے۔ اس نے اب تک نہ تو کسی جاندار شے کو دیکھا ہے اور نہ کوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی ہے۔ لیکن جونہی وہ پُل عبور کرنے لگتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی بہت ہی میٹھی آواز میں اس کا نام پکارے جا رہا ہو۔ وہ سامنے دیکھتا ہے تو پُل کے عین بیچوں بیچ سُرخ کپڑوں میں ملبوس ایک سانولی لڑکی کھڑی ہے، اس کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہیں۔۔۔۔۔ اس کے گالوں

پر صبح کے اوّلیں لمحوں کا سانولا پن اور برسات کی شاموں کی ملاحت ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر گلال کے رنگ ہیں۔ اس کے بالوں میں گھٹاؤں کی نمی اور گہرا پن ہے اُس کی آنکھیں بنفشے کی کلیاں ہیں، اور زرد چاندنی میں نہائے ہوئے جسم کا ہر خط ہر قوس نمایاں ہے۔

"تم اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ اس سے پوچھتا ہے۔

"میں..... ؟" وہ رُکتے ہوئے جواب دیتی ہے۔ "میں سہیل کا انتظار کر رہی ہوں۔"

سہیل نے بتایا کہ اُس نے لڑکی کی بہت منّت کی کہ اپنا نام اور رہنے کی جگہ بتا دے۔ لیکن اُس نے کچھ بھی نہ بتایا۔

"اگر تم سہیل کا انتظار کر رہی ہو تو میں ہی سہیل ہوں۔" آخر تنگ آ کر سہیل نے کہا۔

"بس میری اتنی ہی تمنّا تھی کہ سہیل کو ایک نظر دیکھ لوں..... اب میں چلی جاؤنگی۔"

"مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔" سہیل نے کہا۔ "تمہیں میری تلاش تھی نا ..... اب میں تمھیں مل گیا ہوں ..... میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

"نہیں" اُس نے افسردگی سے جواب دیا۔ "تم ابھی میرے ساتھ نہیں جا سکتے۔"

یہ کہہ وہ مڑی اور چلنے لگی۔ سہیل اس کے پیچھے بھاگا۔ اتنا بھاگا کہ ہلکان ہو گیا۔ اس نے اس کا دامن تھامنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ نہ آئی۔

اس نے اُسے آوازیں دیں۔ لیکن اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا، وہ خواہ تیز رفتاری سے بھاگتا خواہ آہستہ چلتا، لیکن اس کا اور لڑکی کا درمیانی فاصلہ نہ کم ہوتا تھا نہ بڑھتا تھا ــــ کچھ عجیب امید و بیم کی سی کیفیت تھی ــــ جب وہ اس کے پیچھے کافی دور نکل گیا تو اس کی آنکھ کھل گئی ــــ یہ آدھی رات کا سمے تھا۔ اور ستاروں کا غبار آسمان کی نیلاہٹوں میں ہولے ہولے اُڑ رہا تھا۔

"یار، یہ خواب ہمیشہ آدھی رات کے سمے ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد میں کتنی ہی کوشش کر دوں، صبح تک آنکھ نہیں لگتی، اور میں ادھ کھلی آنکھوں سے ستارے گنتا رہتا ہوں۔"

اس دفعہ جب سہیل مجھے ملا تو ماڈل ٹاؤن والی ملاقات کو ایک ماہ گذر چکا تھا...... اس نے کئی دن تک اپنے خواب کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ نہ میں نے ہی پوچھا کہ وہ ایک مہینے تک کہاں غائب رہا۔

ایک صبح میں ناشتے سے پہلے دانتوں کو برش کر رہا تھا کہ وہ آگیا..... میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے، بال اُلجھے ہوئے تھے، اور عینک کا فریم مَیلا ہو گیا تھا.... وہ خاموش خاموش اور پریشان سا تھا...... میں نے اسے چائے پلائی اور ادھر اُدھر کی باتوں میں لگانا چاہا..... اس کی نئی کہانیوں کے بارے میں پوچھا..... وہ میری ہر بات کا جواب بے دلی سے دیتا رہا۔

"کیا بات ہے سہیل، تم اداس کیوں ہو؟" آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔
"بات تو کچھ نہیں ..... تم بھی کہو گے کہ کس شکی سے واسطہ پڑا ہے۔
لیکن یہ حقیقت ہے میرے دوست کہ اب میں وہ خواب جاگتے میں بھی دیکھنے
لگا ہوں ..... بیداری کے عالم میں، اگرچہ یہ خواب تسلسل سے نہیں آتا،
وقفوں سے آتا ہے مگر ..... "

یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

"میں نے اس خواب کو بھلانے کی بہت کوشش کی ..... اپنے گاؤں
کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ کسانوں کے دکھ درد میں شامل ہوا، پھول اگائے
جیپ لے کر مردٹ کے صحراؤں میں گھومتا رہا۔ لیکن اس خواب نے میرا پیچھا نہ
چھوڑا ..... کسانوں کے ہجوم میں مجھے وہی لڑکی دکھائی دی۔ پھولوں میں
اسی کا چہرہ نظر پڑا۔ مردٹ کے صحراؤں میں کسی نہ کسی پگڈنڈی پر، کسی نہ کسی
درخت کے سائے میں، کسی نہ کسی ٹوبے کے کنارے پر مجھے وہی لڑکی ملی۔
کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ میں بے حد خوشگوار موڈ میں سیٹی بجا رہا ہوں، بے حد
محویت کے عالم میں کوئی کہانی لکھ رہا ہوں، بے حد گرم جوشی کے ساتھ کسی کسان
سے باتیں کر رہا ہوں، سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگاتے ہوئے جیپ چلا
رہا ہوں، بڑی محنت سے گلاب کی قلمیں لگا رہا ہوں کہ اچانک وہ لڑکی سامنے آ
جاتی ہے۔ میرا نام لے کر مجھے پکارتی ہے اور جب میں اس کا بازو تھامنے آگے

بڑھتا ہوں تو غائب ہو جاتی ہے۔ میں نے صحرا صحرا اس کی تلاش کی، گاؤں گاؤں اُسے پکارا لیکن وہ مجھے نہ ملی۔"

اس نے رک کر سگریٹ سلگایا اور پھر کہنے لگا۔

"تم شاید اسے بے وقوفی کی انتہا کہو گے کہ میں خوابوں کی ایک لڑکی کے پیچھے یوں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ میرا نام لے کر کیوں پکارتی ہے..... اسے میری تمنا کیوں ہے..... اس کی یہی تمنا، اس کی یہی پکار مجھے اس کی تلاش پر ابھارتی ہے۔ میرے دل میں اس کو حاصل کرنے کی لگن پیدا کرتی ہے۔"

چائے کی پیالی سے بھاپ اُڑتی رہی اور وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگاتا رہا۔

"یا تو وہ خواب میں نہ آئے یا کہیں مل جائے، ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اس درد کی کوئی دوا ہے تو وہ یہی کہ میں اس کو پا لوں..... حاصل کر لوں..... اسے اپنا بنا لوں..... اپنی زندگی کو نارمل رکھنے کے لئے اس کا حصول ضروری ہے..... اب میں نفسیات کی حدیں پھلانگ چکا ہوں..... فرائڈ کے فلسفوں سے آگے نکل گیا ہوں۔ اب میں بچوں کی طرح نہیں بہل سکتا۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے اس لڑکی کو دیکھا ہو۔ اور وہ بہت ہی نامعلوم انداز میں تمہاری محبت کا آدرش بن گئی ہو۔" میں نے اس کا دھیان بٹانے کے

لئے مذاق بھرے لہجے میں کہا۔ "تم اسے صحراؤں اور دور دراز گاؤں میں تلاش کرنے کی بجائے اپنے آس پاس ڈھونڈھو۔ وہ شاید یہیں کہیں مل جائے۔"

وہ چُپ ہو گیا۔ شاید اُسے میرا مذاق بھرا لہجہ پسند نہ آیا تھا۔ شاید یہ خواب اس کے لئے اتنا مقدس بن گیا تھا کہ اس کی تضحیک اُسے گوارا نہ تھی۔

"ممکن ہے یہی بات ہو۔" اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر اس جیسی لڑکی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس کی آواز اس قدر مکمل ہے اور اس نغماتی آواز میں جو نمایاں معنیٰ پنہاں ہوتے ہیں، وہ میں نے کسی اور آواز میں اُبھرتے نہیں دیکھے۔"

"اچھا تم یوں کرو کہ آرام سے گھر بیٹھے رہو..... میں تمہیں بالکل ایسی ہی لڑکی تلاش کر دوں گا۔" میں نے پھر شرارت کی۔

وہ جواب دیئے بغیر اُٹھ کر چلا گیا۔ اس کے چہرے کے تاثر سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے پاگل سمجھتا تھا۔ دسمبر کے اواخر میں کسی کام سے میں ماڈل ٹاؤن گیا۔ سہیل سے ملے بغیر واپس ہو جانا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ وہ مجھ سے شاید ناراض بھی تو تھا۔ میں اس کے گھر چلا گیا۔ وہ لان میں کپڑے کی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ میٹھی میٹھی دھوپ میں یوکلپٹس کے خزاں زدہ پتے اس کی گود میں گر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"بہت دنوں کے بعد آئے ہو دوست ..... آج رات مجھے پھر وہی خواب آیا تھا۔"

"یہ معاملہ تو بڑھتا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے اب تم یورپ چلے جاؤ اور وہاں باقاعدگی سے اپنا علاج کرواؤ۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" آج وہ خلافِ معمول خوش نظر آ رہا تھا۔ "اب میں چاہتا ہوں کہ یہ خواب آتا رہے۔ چونکہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ خواب سچا ہو جائے گا۔ اس ہی زندگی کی طرح دھڑکتی ہوئی وہ حقیقت مجھے مل جائے گی۔ آج رات مجھے جب یہ خواب آیا تو میں نے دیکھا ندی کے اُس محرابی پُل پر جہاں وہ لڑکی مجھے ملتی ہے، ایک بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اور بورڈ پر ایک تیر کا نشان تھا، اور اس نشان کے نیچے موٹے موٹے لفظوں میں لکھا تھا...... خشک جھیل ـــ ۲۵۰ میل۔"

"اس کا کیا مطلب؟"

"اُس کا مطلب یہ کہ وہ لڑکی مجھے کسی خشک جھیل پر ملے گی جو ندی کے پُل سے ۲۵۰ میل کے فاصلے پر ہے ....... وہ لڑکی لازماً اس خشک جھیل پر یا اس کے آس پاس رہتی ہو گی۔"

"لیکن وہ خشک جھیل کونسی ہے؟"

"یہی تو پتہ چلانا ہے ..... اگر میں اپنے گاؤں کے جنوبی صحرا سے تیر کے

نشان کی سمت کے مطابق چلتا جاؤں تو ۲۵۰ میل کے بعد وہ خشک جھیل ضرور مل جائے گی۔" اس کے لہجے میں پیغمبروں کا سا اعتماد تھا۔

مجھے بھی ایک انجانے سے جذبے کے تحت سہیل کے خواب کی سچائی کا یقین ہو چلا تھا۔ میں اب یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ سہیل کے خوابوں کی لڑکی ضرور کہیں نہ کہیں موجود ہے اور وہ ضرور اُسے مل جائے گی۔۔۔ خشک جھیل اور لڑکی۔۔۔۔ لیکن میری عقل نے یہ سب کچھ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔۔۔۔ بہر حال میں خشک جھیل اور لڑکی کی تلاش میں سہیل کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ اور کچھ نہیں تو ایڈونچر ہی سہی۔۔۔ میں نے سوچا۔

"تو تم اس سفر کا آغاز کرنے اپنے گاؤں کب جا رہے ہو؟" میں نے سہیل سے پوچھا۔ "میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں"۔

"لیکن میں تمہیں اپنے ہمراہ نہیں لے جا سکتا۔ اس کا مجھے افسوس ہے" اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ "لیکن یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ شادی کے بعد تمہاری بھابی سے تمہیں ضرور ملواؤں گا"۔

"خدا خدا کرو سہیل"۔ میں ہنس پڑا۔ "تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ تم واقعی اس لڑکی کو ڈھونڈ لو گے۔ جو ابھی سے شادی کی سوچ رہے ہو"۔

اس نے جواب میں اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سنہری انگوٹھی نکالی اور اسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کہنے لگا۔ "یہ انگوٹھی دیکھ رہے ہو۔۔۔ یہ میں نے

چھ سال سے خرید کر رکھی ہوئی ہے۔ تمھیں اس لئے نہیں بتایا کہ تم مذاق نہ اڑانے لگو...... لیکن اب جبکہ میں نے اس لڑکی کو پا لیا ہے تو یہ انگوٹھی تمہیں دکھانے میں کوئی ہرج نہیں "۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں تھرتھرا رہے تھے۔

"یا خدا، تمھارا دماغ تو صحیح ہے یا واقعی پاگل ہو گئے ہو۔ ابھی تمہیں وہ لڑکی کہاں ملی ہے۔ ابھی تو تمہیں اس کی تلاش میں سفر کرنا ہے"۔

وہ چند ثانیے خاموش رہا...... پھر آنکھیں جھکا کے خواب آلود لہجے میں کہنے لگا :

"پرسوں میری منگنی ہو گئی ہے —————— چھ سال پہلے ہمارے رشتے کی بات چلی تھی ٹوٹ گئی تھی ............ اور میرے گاؤں سے لاہور پورے ۲۵۰ میل کے فاصلے پر ہے"۔

"لیکن مغل جمیل؟" میں بولا گیا۔

"دیہات ہریالی کے سمندر ہیں...... ان کے مقابلے میں شہر خشک جھیلیں نہیں تو کیا ہیں؟"۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

معاً مجھے دریچہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے نظریں اٹھا کے سامنے دیکھا نو کوٹھی کے جنوبی کمرے کے ادھ کھلے دریچے میں سے ایک حجاب آلود سانولا چہرہ اپنی آنکھوں میں ستاروں کی تابانی لئے، جھینپے جھینپے انداز

میں سہیل کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری نظروں کا سامنا ہوتے ہی وہ چہرہ غڑاپ سے کمرے میں ڈوب گیا۔

میں بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

سہیل کو یہ پتہ ہی نہ چلا کہ کسی نے اس کو دریچے میں سے دیکھنے کی کوشش کی تھی ...... اس کی آنکھیں بدستور جھکی ہوئی تھیں....

اور مجھے جھکی جھکی آنکھوں والے اس کہانی کار لڑکے پر بے حد پیار آ رہا تھا

# صحرا کی زنجیر

خوشگوار صبح کے میٹھے میٹھے لمحوں کے درمیان، ڈاکٹر اور اس کا نوجوان دوست، کا کرا آڈسپنسری کے پچھواڑے قدرتی لان میں بڑی تندہی کے ساتھ ٹینس کھیلنے میں مصروف تھے ـــــ بھوسلے بالوں والا گیدڑ کا بچہ جو بائیں جانب کانٹے دار تاروں کے جنگلے میں قید تھا، اُچھلتی گیند اور گھومتے ریکٹوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا ـــــ دونوں کھلاڑی پوائنٹ گننے کے علاوہ ایک دوسرے کے کھیل پر طنز بھرے فقرے بھی کس رہے تھے ـــــ سفید گیند، صحرا کی بھاری ہوا میں نیلی پڑگئی تھی اور وہ مختلف زاویوں سے اس پر ریکٹوں سے کاری ضربیں لگا رہے تھے۔ اُن کے اردگرد پھیلے ہوئے ریت کے اونچے نیچے ٹیلے صبح کی دلنواز نیلاہٹوں میں بے حد خاموش اور پرسکون تھے۔

"ڈاکڑ! تم ہار رہے ہو" — کاکڑا معاً چلایا —
"نکو تہیں — گیدڑ کی اولاد"—

کاکڑا نے اپنی زبان میں جو بیکانیری اور بہاولپوری زبان کا ایک عجیب سا ملغوبہ تھی، ڈاکڑ کو ایک موٹی سی گالی دی — ڈاکڑ ہنس پڑا — اگرچہ اُن کی زبانیں علیحدہ علیحدہ تھیں، اور ڈاکڑ اس علاقے میں دو برس کے قیام کے باوجود یہاں کی زبان پوری طرح سیکھ نہ پایا تھا، لیکن سات سو ستائیس دنوں کی اس طویل مدّت نے ان کو باہم اس قدر قریب کر دیا تھا کہ زبان کی اجنبیت اب اجنبیت نہ رہی تھی — وہ لہجے سے ایک دوسرے کا مطلب سمجھ جاتے تھے — اور آنکھوں سے ایک دوسرے کے جذبات کی گہرائیوں میں اُتر جاتے تھے — شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن دونوں کی ذہنی افتاد ایک جیسی تھی — دونوں کا ذہن بنیادی طور پر سائنسی ترتیب لئے ہوئے تھا — دونوں میں تجسّس کا ایک جذبہ تھا — دونوں کا رویّہ کائنات اور فطرت کے لئے بے حد متوازن، متحمل اور بردبار تھا۔ دونوں شخص جلد باز اور کسی حد تک بے رحم تھے — اب اگرچہ ڈاکڑ کے مزاج میں تُندی اور جذباتیت آگئی تھی، لیکن اس کا نوجوان دوست، کاکڑا جو ایک لحاظ سے اس کا نائب بن گیا تھا، اپنی شادماں ذہانت کا بجا فوید ستور تیز کرتا رہا — کاکڑا، شکل سے تو، نو دس برس کا لگتا تھا، لیکن اس کی

عمر چودہ سال سے کسی طرح بھی کم نہ تھی ــــ اور وہ زندگی سے ایک مخصوص احتیاط کے ساتھ معاملہ کرتا تھا، جیسے یہ ایک آتش گیر مادہ ہو اور کسی بھی لمحے بھک سے اڑ سکتا ہو!

ڈاکرٹے نے اپنے جسم کو بائیں طرف ایک ذرا جھکا کر، پوری قوت سے ریکٹ گھمایا، لیکن وار اوچھا پڑا اور گیند ریکٹ کی زد سے صاف بچ کر، اُس کے سر کے اوپر سے ہوتی ہوئی گہرے کی عقبی جھاڑیوں میں غائب ہو گئی ــــ یہ جھاڑیاں مغرب کی جانب سے ریت کے کئی ٹیلوں کو ڈھانپتی ہوئی ایک اُلٹی تکون کی شکل میں، تین میل تک چلی گئی تھیں۔

"آج کچھ ڈھیلے ہو ڈاکدار صاحب" ــــ کاکرا نے مسکرا کر کہا ــــ "دراصل تم نے زیادہ سوچنا شروع کر دیا ہے ــــ کوئی گولیاں وغیرہ کھاؤ طاقت کی۔"

"میں تنگ آچکا ہوں کاکرے ــــ اس زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔" ــــ ڈاکرٹے نے کہا ــــ اور پھر گیند کے جنگلے کے قریب سے ہوتا ہوا گہرے کی جھاڑیوں میں گیند ڈھونڈنے چلا گیا۔ جھاڑیاں بے حد گھنی اور خاردار تھیں ــــ کئی جھاڑیوں کا گھیر کئی سو فیٹ تھا ــــ ان میں گیند تلاش کرنا آسان کام نہ تھا ــــ یہاں حبس بھی تھا ــــ ڈاکرٹے پسینے میں شرابور کانٹوں سے بچتا بچاتا، ایک ہاتھ میں ریکٹ لئے زیرِ لب گالیاں بک رہا تھا ــــ اس کا وزن پہلے سے تیس پونڈ کم ہو گیا تھا ــــ نوکدار

بغیر گوشت کی کہنیاں، قمیص کی آستینوں سے باہر جھانکنے لگی تھیں اور بہت بُری معلوم ہوتی تھیں ۔۔۔ گھٹنے بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے ۔۔۔ جبڑوں پر گوشت منڈھا گیا تھا اور ستواں ناک کا بانسہ، پتلے دُبلے چہرے پر بڑا عجیب سا لگتا تھا ۔۔۔

"گیند اُدھر ہے ڈاکٹر! ۔۔۔ جہاں تم کھڑے ہو، اُس کے پاس ہی ذرا بائیں طرف" ۔۔۔ کاکڑا چلّا چلّا کر اُسے ہدایات دے رہا تھا ۔۔۔

لیکن ڈاکٹر کو گیند نظر نہ آئی ۔۔۔ اس نے غصے سے کہا ۔۔۔ "ابے کاکڑے کے بچے! تجھے ٹینس سکھانے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ ہر روز گیند گم کیا کرے۔"

اس پر کاکڑا دوڑتا دوڑا آیا اور کانٹوں سے بے پرواہ، جھاڑیوں میں دندناتا ہوا گھس گیا ۔۔۔ نیچے زمین پر بکھرے ہوئے کانٹوں نے اُس کے پیروں میں چبھنا چاہا، لیکن فولاد آسا سختی کے سامنے ہار مان کر ٹوٹ گئے ۔۔۔ اس نے ایک جھاڑی کی پتلی پتلی خاردار شاخوں کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹایا اور پھر آگے کو جھک کر جھاڑی کی تہہ میں سے گیند نکال لی ۔۔۔

"یہ آخری گیند ہے ۔۔۔ جس دن گم ہو گئی اور نہ ملی تو کھیل بند ہو جائے گا" ۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"سردس میری ہے نا ۔۔۔؟" کاکڑے نے پوچھا۔

"ہاں ۔۔ ذرا ٹھہرو ۔۔ میں ہاتھ دھو آؤں ۔۔ کہ یہ کی بو آ گئی ہے ان میں" ۔۔ ڈاکٹر یہ کہہ کر ڈسپنسری میں گھس گیا ۔۔ دواؤں کی مختلف رنگوں کی شیشیوں کے درمیان سے گذرتا ہوا وہ ساتھ والی کوٹھری میں چلا گیا، جس کو وہ بیک وقت سونے اور نہانے وغیرہ کے لئے استعمال کرتا تھا ۔۔ باہر آیا تو وہ سامنے کھڑے تھے ۔۔ انھوں نے وہاں کے ایک صحرائی قبیلے کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا ۔۔ اور ہاتھوں میں موٹی موٹی مضبوط لاٹھیاں تھامی ہوئی تھیں ۔۔

"بیمار ہو ۔۔؟" اس نے وہاں کی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اُن سے پوچھا۔

انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آج جمعہ ہے ۔۔ اور جمعہ کے دن میری چھٹی ہوتی ہے ۔۔ پھر آخر کس لئے آئے ہو ۔۔؟"

"ہمیں سردار نے بھیجا ہے ۔۔ خون دینے کے لئے"۔

"اچھا اچھا ۔۔ ذرا ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں"۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ دو سرنجیں اور ایک بوتل لے کر ڈسپنسری سے نکلا۔ وہ ان دنوں بہاولپور کے ڈائریکٹر ہیلتھ کی ہدایت کے مطابق، صحرائے مروٹ کے مختلف قبائل کے خون کے نمونے جمع کر رہا تھا، تاکہ یہ پتہ چلایا جا سکے کہ زرد بخار پھیلانے والے جراثیم ان لوگوں کے خون میں شامل ہیں یا

صحرائی ہوا میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے سرنجوں میں سوئیاں فٹ کیں اور وہ دونوں بڑی رقت سے باہم گلے ملنے کے بعد بے حد مایوسی کے عالم میں سر جھکا کر بیٹھ گئے۔
"اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی" ڈاکٹر نے انھیں یقین دلایا۔
"تکلیف ہو یا نہ ہو۔۔۔ ہم مرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔۔۔ سردار کا حکم جو ہوا" ۔۔۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔
"مرنے کے لئے" ۔۔۔ ڈاکٹر نے حیران ہو کر کہا۔ "لیکن تم اس سے مر کیسے جاؤ گے۔۔۔ ارے یہ سوئی تو کریر کے کانٹے سے بھی چھوٹی ہے، بزدل ہو تم۔۔۔؟" دوسرے آدمی نے اپنا سر اٹھایا اور ڈاکٹر کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔۔۔ "سردار نے ہمیں اپنا خون دینے کو کہا تھا۔۔۔"
"ہاں ہاں خون تو چاہیئے۔۔۔ لیکن سارا خون نہیں، بس تھوڑا سا۔"
پہلے آدمی نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "سردار آسمان کی مخلوق ہے۔۔۔ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔۔۔"
ڈاکٹر جھلا گیا۔۔۔ "اچھا تو جاؤ دفع ہو جاؤ۔۔۔ نکل جاؤ یہاں سے۔۔۔ بزدل کہیں کے۔۔۔"
وہ کھڑے ہو گئے اور بڑے وقار سے سینے تان کر کہنے لگے۔۔۔ "ہم

مرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ دیر تو تمہاری طرف سے ہو رہی ہے ڈاکڈر۔"

ڈاکڑ نے جھنجلا کر ڈسپنسری کا دروازہ کھٹاک سے بند کر دیا اور اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔۔۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر کے، اگر یہاں ہی آنا تھا، تو لعنت ہے کنگ ایڈورڈ کالج پر اور اس لمبی سی ڈگری پر۔۔۔

باہر سے کاکڑے کی آواز آ رہی تھی۔۔۔ "او۔ے اب پھر بھاگنا چاہتا ہے۔۔۔ اب تو تیرے باپ کو بھی بھاگنے نہ دوں۔"

اس نے سانپ کو رسّی کی مانند اپنی گردن کے ارد گرد لپیٹ لیا اور اس کے سَر کو مضبوطی سے مٹھی میں بھینچ لیا۔۔۔ اور وہ گیت گنگنانے لگا، جو اس کے قبیلے کی عورتیں چاندنی راتوں میں ریت کے ٹیلوں پر گاتی تھیں۔۔۔

موے ہونٹ ناگن کے ایسے سُرخ ہیں
میں پھنیر ناگن کی طرح بَل کھاتی ہوں
تم میرے نزدیک کیوں آتے ہو،

اور ڈاکڑ نے گراموفون مشین پر ایک فلمی ریکارڈ لگا دیا۔۔۔ نسوانی آواز سُروں کا سہارا لے کر، صحرا کی وسعت میں بکھرنے لگی۔۔۔ اور کاکڑا ایک بار پھر حیران ہو کر سوچنے لگا کہ ڈاکڑ کو یہ آواز نہ جانے کیوں پسند ہے۔۔۔ وہ جب بھی اداس ہوتا ہے، تو یہی ریکارڈ سنتا ہے۔۔۔ ذاتی طور پر اُسے عورت کی آواز پسند نہ تھی خواہ کتنی ہی سُریلی ہو۔۔۔ اُسے کئی عورتوں

کے ساتھ سونے کا اتفاق بھی ہوا تھا ــــ اور جذبات کے میٹھے میٹھے اشتغال کے باوجود، اُسے یہ بات بھی قطعی غیر اہم محسوس ہوتی تھی ــــ اُسے عورت اور عورت کی آواز سے زیادہ ڈاکٹر کی ڈسپنسری میں پڑی ہوئی دواؤں کی نیلی پیلی شیشیوں اور مختلف چمکیلے اوزاروں سے دلچسپی تھی ــــ

ریکارڈ ختم ہو گیا ــــ نسوانی آواز اپنے سُروں اور سازوں کی ساری لرزش کے ساتھ انجانی گہرائیوں میں ڈوب گئی ــــ اور کاکڑے نے اپنی گردن کے گرد لپیٹے ہوئے بے دم، بے سُدھ سے سانپ کو زمین پر پھینک دیا اور جیب سے ایک بدہیئت سا چاقو نکال کر بڑی صفائی سے اس کا سر قلم کر دیا ــــ سر اور دھڑ، کچھ دیر تک الگ الگ ریت پر تڑپتے رہے تب اُسے معلوم ہوا کہ یہ سانپ نہیں سپنی ہے ــــ اس کی آنکھوں میں ایک پُراسرار چمک پیدا ہوئی ــــ چاقو ایک بار پھر فضا میں لہرایا ــــ اور تھوڑی دیر بعد، انڈوں کی جھلی اس کے ہاتھ میں تھی ــــ شفاف، چکنی جھلی میں چھوٹے چھوٹے مٹیالے انڈے چمک رہے تھے ــــ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ موج میں سیٹی بجاتا ہوا ڈسپنسری کی طرف چلا گیا ــــ سورج آسمان سے ذرا نیچے چمک رہا تھا ــــ درختوں کے سلئے ہولے ہولے سمٹ رہے تھے ــــ اور اس کی ننگی پیٹھ پر ایک مٹے ہوئے زہریلے زخم کا ترچھا نشان دھوپ میں واضح ہو رہا تھا ــــ

اور اس کے سینے پر لوہے کا ایک زنگ آلود تعویذ لٹک رہا تھا، جس پر عجیب و غریب تحریر کندہ تھی۔ یہ اُسے اُس کے تاؤ کی لڑکی نے دیا تھا ——— تاکہ وہ صحرا کی تمام آفات اور بلاؤں سے محفوظ رہ سکے۔ ڈسپنسری میں آکر اس نے سنپنی کے انڈوں کی تھیلی بڑی احتیاط سے ڈاکٹر کی میز پر رکھ دی۔

"یہ کیوں لے آئے ——— اب مجھے سانپ کے مزید انڈوں کی ضرورت نہیں ——— ان انڈوں سے زرد بخار کے انجکشن تیار نہیں ہو سکتے ——— چونکہ ان میں اس کے جراثیم نہیں پائے جاتے" ——— ڈاکٹر نے انگڑائی لے کر اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا ——— اور کھڑکی میں سے باہر، دُور تک پھیلی ہوئی صحرائی وادی کو دیکھنے لگا ——— یہاں سے کبھی مشہور سیاح ابنِ بطوطہ گذرا تھا ——— ڈاکٹر کے ذہن میں ابن بطوطہ کے سفرنامے کے کئی حصے اُجاگر ہونے لگے ——— وہ لکھتا ہے کہ مروٹ کا علاقہ بے حد شاداب اور زرخیز ہے ——— یہاں انجیر کے درخت بھی اُگتے ہیں اور اس علاقے کے عین درمیان دریائے ہاکڑہ بڑی متوالی چال کے ساتھ بہتا ہے ——— اور یہیں کہیں گم ہو جاتا ہے ——— خوش قسمت تھا ابنِ بطوطہ کہ ایسے خوشگوار وقتوں میں یہاں سے گزر گیا ——— ڈاکٹر نے از حد بور ہو کر سوچا ——— ان دنوں گزرنا پڑتا تو نانی یاد آجاتی آنجناب کو ———

لیکن یہاں سے ہو کر، محمود غزنوی کے جیالے شہسوار بھی تو گزرے تھے۔ سومناتھ پر چڑھائی کرنے کو — اور انھی صحراؤں میں ایک محبِ وطن سادھو نے انھیں راہ سے بھٹکا دیا تھا — اور انھوں نے تین دن تک اونٹوں کے کوہان کاٹ کاٹ کر اپنی پیاس بجھائی تھی — تب ڈاکٹر کو یاد آیا، کہ اب بھی جب دوپہریں جہنم بن جاتی ہیں اور راتیں اپنے چہروں پر چاندنی کا غازہ مل لیتی ہیں، تو صحرا کے وسط سے اونٹوں کی گھنٹیاں اور گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی ہیں — اور اس کا جسم ایک انجانے خوف سے لرز اٹھا۔

سورج آسمان کے بیچوں بیچ آگیا تھا — سائے غائب ہو گئے تھے — اور صحرا کی کوکھ سے گرم ہوا کے وحشی بگولے اٹھنے شروع ہو گئے تھے ڈاکٹر بڑی محبت اور بڑی نفرت کے ساتھ اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

وہ آج سے دو سال قبل، اکتوبر کے مہینے میں ہاروں آباد سے ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا تھا — پہلے اس جگہ صرف ایک کمپاؤنڈر رہتا تھا۔ لیکن جب زرد بخار کا متعدّی مرض کسی طرح بھی رکنے میں نہ آیا، تو حکومت نے اس خیال سے کہ یہ مرض یہاں سے اڑ کر آباد علاقوں میں نہ پھیل جائے اس کی فوری روک تھام کے لئے اسے یہاں بھیج دیا۔ زرد بخار پر بڑی حد تک قابو پایا جا چکا تھا۔ اور اب وہ بہاولپور کے ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز

کے حکم پر اس مرض کے اسباب و وجوہ اور اس کو روکنے کی عملی تدابیر پر ریسرچ کر رہا تھا — ہر ہفتے فورٹ عباس سے ایک ملیٹری جیپ آتی اور اس کی ضرورت کی چیزیں اسے پہنچا جاتی — شادی ابھی ہوئی نہیں تھی، ماں باپ مر کھپ چکے تھے۔ دوست زندگی کے ہنگاموں میں بچھڑ گئے تھے۔ اس لئے وہ دو سال سے بور ہونے کے باوجود، اس ویران صحرا میں بیٹھا تھا۔

یہاں آتے ہی، اس نے ایک بچے کو چمٹے ہوئے زرد بخار کو دوائی کے پے در پے حملوں سے بھگا دیا، اور ساری صحرائی وادی میں "ڈاکدار" کا ڈنکا بج گیا — شام و سحر اس کے ارد گرد مریضوں کی بھیڑ رہنے لگی — پہلے پہل اس کے پاس اینٹی بائیوٹکس اور اسپرین وغیرہ کا ذخیرہ بہت کم تھا — لیکن اس کے کہنے پر جلد ہی محکمہ صحت نے یہ کمی پوری کر دی۔ اور اب تو وہ پورا ساماں نہ ہونے کے باوجود چھوٹے موٹے آپریشن بھی کر تا تھا۔ یہ آپریشن اکثر کامیاب رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ "ڈاکدار" ہونے کے علاوہ ان لوگوں میں غیر معمولی قوتوں والی ایک مقدس ہستی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور یہ لوگ اسے کبھی کبھی "ڈاکدار پیر" کہہ کہہ بھی پکارنے لگے۔

کاکرڈا کہہ رہا تھا — "ڈاکدار، تم یہ ریکارڈ نہ سُنا کرو — اِس

سے تم میں کمزوری آجاتی ہے"۔

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا اور باہر جا کر گیدڑ کے بچے سے دل بہلانے لگا — سیاہ تھوتھنی اور جھبلے بالوں والا یہ گیدڑ کا بچہ اُسے ایک مریض نے بطور تحفہ دیا تھا —

"اس سے شادی کر لو — جب بھی طبیعت خراب ہوتی ہے، اس کے پاس چلے جاتے ہو — بھین پاڑ!" — کاکڑا گیدڑ کے بچے کی طرف ڈاکٹر کا التفات دیکھ کر جھنجھلا گیا تھا — اور ڈسپنسری کے دروازے میں کھڑا دھاڑ رہا تھا۔

ڈاکٹر مڑا اور دُکھ بھری آواز میں کہنے لگا — "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کاکڑے! — میں واپس گھر جا رہا ہوں" —

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے" — کاکڑے نے کہا اور پھر باہر آ گیا۔

وہ دونوں، موت کے انتظار میں اب تک ایک کیکر کے درخت تلے بیٹھے تھے — سردار کا حکم ٹالنا ان کے بس کی بات نہ تھی —

کاکڑا ڈاکٹر کے نزدیک آ کر کہنے لگا "تمہارے جانے کے بعد میں تمہاری جگہ لے سکتا ہوں۔ بڑے ڈاکدار سے سفارش کر کے، مجھے یہاں کا ڈاکدار بنا جانا — بنا جاؤ گے نا —؟"

"نہیں" ــــ ڈاکٹر نے جھنجھلا کر سختی سے جواب دیا۔ "ڈاکٹری تم ایسے جنگلیوں کے بس کا روگ نہیں۔"

کاکڑے نے اصرار کیا۔ "میں شیشیوں کے لیبل پڑھ سکتا ہوں ــــ ڈاکداری کی کتابیں پڑھنا کوئی مشکل نہیں ــــ میں زیادہ سے زیادہ دو مہینوں میں ساری کتابیں پڑھ لوں گا ــــ آخر تمہیں اعتراض کیا ہے" ــــ یہ کہہ کر کاکڑے نے ڈاکٹر کی عینک اتار کر اپنی آنکھوں پر لگالی ــــ "میں ڈاکدار تو بڑی آسانی سے بن سکتا ہوں ــــ یہ دوسری بات ہے کہ ڈاکدار پیر نہ بن سکوں ــــ تمہاری طرح ــــ"

"ڈاکدار پیر" ــــ ڈاکٹر نے اس سے اپنی عینک چھینتے ہوئے کہا ــــ "میں اس سے تنگ آچکا ہوں ــــ تم لوگوں نے مجھے انسان سے خدا بنا دیا ہے ــــ اور یہ خدائی میری جان کا عذاب بن کر رہ گئی ہے" ــــ ڈاکٹر کی نظریں دور خلا میں بھٹک گئیں اور اس کا ہاتھ گیدڑ کے بچے کو ہولے ہولے سہلاتا رہا ــــ وہ دونوں اب تک کیکر کے درخت تلے بیٹھے اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔

"رات کو سو جاتا ہوں ــــ صبح اٹھتا ہوں ــــ جنگلیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کوئی قدم چومتا ہے کوئی سجدے کرتا ہے" ــــ "ٹینس کے علاوہ اور کوئی تفریح ہی نہیں ــــ اس روز کے بندھے ٹکے معمول سے

آدمی تنگ نہ آئے تو کیا کرے ۔۔۔ بہرحال میں نے پکا فیصلہ کر لیا ہے کاکڑے! کہ اب میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم یہاں سے جاکر خوش نہ رہ سکو۔۔۔" کاکڑے نے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" ڈاکڑ کے جواب میں طنز کی تلخی تھی ۔۔۔ لاہور ایسے شہر میں'۔۔۔ گلبرگ میں ایک عمدہ بنگلہ ہو۔ معقول آمدنی ہو۔۔۔ بہترین تفریحیں ہوں ۔۔۔ نئی شیورلیٹ ہو۔۔۔ پھر بھلا کون خوش رہ سکتا ہے۔۔۔ خوشی تو ان اُجاڑ جگہوں میں ملتی ہے ہے نا؟"

"یہ شیورلیٹ کیا بلا ہے" ۔۔۔ کاکڑے نے پوچھا

"ایک دوسرا ڈاکدار پیر"۔۔۔ ڈاکڑ نے ہونٹ بھینچ کر جواب دیا

تم واقعی بیمار ہو گئے ہو ڈاکدار۔۔۔!" کاکڑے نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے لاابالی پن سے کہا۔۔۔ "اور تمہاری اس بیماری کا کوئی علاج نہیں، ۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ جاتے ہوئے اس گیدڑ کے بچے کو ساتھ لے جاؤ گے؟"

"ابھی میں نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

ڈاکڑ نے گیدڑ کے بچے کو ستانا شروع کر دیا ۔۔۔ وہ غریب پہلے تفریح کے موڈ میں رہا۔ پھر تنگ آکر غرّانے لگا۔۔۔ کاکڑا اس منظر سے بہت محظوظ ہوا اور لہک لہک کر زور زور سے گیدڑوں کی آوازیں نکالنے لگا۔۔۔

گیدڑ کے بچے نے بھی ایک طرف منہ اُٹھا کر رونا شروع کر دیا!

"ہاں" ــــ ڈاکرڑے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ــــ "میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا"۔

"اور اپنے بابُو[1] کو بھی" ــــ؟ کاکرڑے کا اشارہ اپنے تاؤ کی لڑکی کی طرف تھا۔

ڈاکرڑے نے کوئی جواب نہ دیا۔

"وہ تمہیں ہرگز نہ جانے دے گی" ــــ کاکرڑے نے کہا ــــ "اگر تم نے اُس کے بغیر اس علاقے سے باہر قدم رکھا تو وہ تمہیں قتل کر دے گی"۔

"اچھا خیر ــــ دیکھا جائے گا ــــ تم اپنی بکواس بند کرو"۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جب ڈاکرڑا اپنی رائفل لے کر باہر نکلا تو اسے معلوم ہوا کہ ان صحراؤں میں چپکے سے بہار آ گئی ہے ــــ کریہ کی خاردار جھاڑیاں سرخ شگوفوں سے لد گئی ہیں ــــ اور ریت کے ٹیلوں کی ڈھلوانوں پر نرم نرم گھاس اُگ آئی ہے اور فضا میں ایک نکھرا ستھرا مقدّس سکون ہے۔ وہ گوری ٹوبہ[2] کی طرف جانے والے راستہ پر ہو لیا ــــ ٹوبے پر پہنچنے کے بعد وہ گھوم کر دائیں جانب مڑ گیا ــــ یہاں سے ایک پتلی سی پگڈنڈی

---

[1] بابُو: لڑکی۔ محبوبہ [2] ٹوبہ: برسات کے پانی کا تالاب

جنگلی جھاڑیوں میں سے ہوتی ہوئی لالہ ڈھوک[1] تک چلی گئی تھی ـــــ اور وہ لالہ ڈھوک ہی جا رہا تھا ـــــ کاکہ ڈبے کے تاؤ کی لڑکی اور اپنی بابو سے آخری ملاقات کرنے ـــــ

وہ خواب کے سے عالم میں پگڈنڈی پر چلتا رہا ـــ سرکنڈوں اور کیکروں کے جھنڈ بے حد گھنے تھے ـــــ اور ان کے نیچے سے گذرنے والی سرنگ نما پگڈنڈی پہ پراسرار دھندلکا پھیلا ہوا تھا ـــ کریر کے سُرخ شگوفوں کی مہکار ہوا میں رچی ہوئی تھی ـــ کبھی کبھی کوئی گیدڑوں کا جوڑا یا منحوس شکل والی پچھل پیری[2] اس کا راستہ کاٹ کر سرکنڈوں میں غائب ہو جاتی ـــ اس نے سگرٹ سلگا لیا اور اپنی رفتار آہستہ کر دی، ـــــ یکایک وہ چونک پڑا۔ کریر کی ایک گھنی جھاڑی کے عقب میں اُسے دو حرکت کرتے ہوئے سیاہ دھبے دکھائی پڑے، کالے ہرن ـــ اس نے سوچا ـــ بڑے عرصے کے بعد دکھلائی دیے ہیں ـــ اس نے رائفل لوڈ کر لی اور دبے دبے قدموں سے آگے بڑھا ـــ وہ دونوں ـــ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ـــ باہم اختلاط میں مصروف تھے ـــ ہرنی کے اُدھ کھلے منہ سے ہلکی ہلکی لذت انگیز سیٹیوں کی سی آوازیں نکل رہی تھیں

---

[1] ڈھوک: آبادی ـ ڈیرا [2] پچھل پیری: ایک صحرائی جانور جس کے پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوتے ہیں۔

— اور ہرن کا سانس پھولا ہوا تھا — اور وہ بار بار اپنی تھوتھنی سے ہرنی کی گردن پر بوسے ثبت کر رہا تھا — بہار کے دن ہیں۔ ڈاکٹر نے ایک انجانی سی اندرونی خلش سے بے قرار ہو کر سوچا — اور بہار کا احترام لازم ہے — اس کی اٹھی ہوئی رائفل جھک گئی — اور وہ دبے پاؤں آگے بڑھ گیا — وہ انجانی سی اندرونی خلش بڑھتی گئی — اور جب اس نے جھنڈوں سے نکل کر، اوپر نیلے کانچ آسمان پر کونجوں کی ڈار دیکھی تو اس کو ضبط کرنا مشکل ہو گیا — اور اس نے رائفل کا منہ آسمان کی طرف کر کے، لبلبی دبا دی — پورا صحرا گونج اٹھا — قریبی جھاڑیوں سے ایک بچے نے بڑی طرح چیخ ماری — دو کونجیں ڈار سے بچھڑ کر نیچے آن گریں اور جھاڑیوں میں گم ہو گئیں —

یہ سب کچھ جیسے جادو کے زور سے ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کو کچھ پتہ نہیں چلا تھا کہ اس نے کب ٹریگر دبایا اور کب گولی چلی — شاید وہی بے قرار کرنے والی اندرونی خلش تھی، جو گولی بن کر سنسنا گئی تھی — سارے درختوں پر صحرائی پرندوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس شور کے درمیان شمال کی جانب کیکر کے جھنڈ سے آتی ہوئی اُن جنگلیوں کی آوازیں صاف سن سکتا تھا جو غالباً اپنی جھونپڑیوں کے لئے لکڑیاں کاٹنے میں مصروف تھے۔

چند لمحوں بعد ایک ننگ دھڑنگ سیاہ فام بچہ "ڈاکدار پیر۔۔۔ ڈاکدار پیر" چلاتا ہوا، بھاگا بھاگا آیا، اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔۔۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے رائفل کو دیکھنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں۔۔۔ میں تمھیں نہیں ماروں گا۔" ڈاکٹر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔

بچے نے اپنے سپید سپید دانت نکال دیئے۔

کچھ دیر بعد وہ لالہ ڈھوک پہنچ گیا۔۔۔ بچہ بڑے غرور سے چھاتی تانے آگے آگے چل رہا تھا، جیسے اسے کوئی بہت بڑا اعزاز مل گیا ہو، کیکر کی لکڑی اور سرکنڈوں سے تعمیر شدہ دو، دو منزلہ جھونپڑیوں میں سے بچے "ڈاکدار پیر آگیا۔۔۔ ڈاکدار پیر آگیا" چلاتے ہوئے فوج در فوج باہر نکل رہے تھے اور بھاگم بھاگ اُس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ کچھ نے اس کو گھیرے میں لے کر ناچنا شروع کر دیا تھا۔۔۔ کچھ اُچھل اُچھل کر رائفل کی نالی کو چھونے کی کوشش میں تھے۔ کچھ محض اس کا منہ تکنے پر اکتفا کر رہے تھے۔۔۔ اور چند ایک بڑی بے تکلفی سے اس کی پتلون کی جیبیں ٹٹول رہے رہے تھے۔۔۔ مرد سارے کے سارے لکڑیاں کاٹنے باہر گئے ہوئے تھے، ۔۔۔ پوری ڈھوک میں عورتیں تھیں، یا بچے۔۔۔ عورتیں، جھونپڑیوں کے دروازے کھولے دہلیزوں میں کھڑی تھیں۔۔۔ ہر ایک اُسے اپنے ہاں

آنے اور کچھ کھانے پینے کی دعوت دے رہی تھی ـــ وہ ان جھونپڑیوں میں سے آتی ہوئی اونٹنیوں کے دودھ کی بساند بخوبی سونگھ سکتا تھا۔ ایک عورت اپنی دہلیز کے سامنے "ذبح شدہ" گیدڑ کی کھال اتارنے میں مصروف تھی ـــ ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی ـــ اور اپنی مضبوط ننگی چھاتیاں مٹکاتے ہوئے کہنے لگی ـــ

"ڈاکدار پیر! آج گیدڑ کا گوشت پکے گا ـــ آؤ اندر آجاؤ ـــ"

ڈاکٹر کو اُبکائی آگئی اور وہ سنی اَن سُنی کر کے آگے بڑھ گیا۔

لالہ ڈھوک بڑی عجیب و غریب آبادی تھی ـــ ایک بڑے سے ریت کے ٹیلے کے دامن میں آباد، اس ڈھوک کی جھونپڑیاں، جاپان کے ان پگوڈوں سے مشابہ تھیں، جن کی تصویریں اُس نے کئی رسالوں میں دیکھی تھیں ـــ یہ جھونپڑیاں دو سیدھے خطوط کی شکل میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی تھیں ـــ گلی میں کہیں کہیں کیکر اور آک کے درخت اُگے ہوئے تھے ـــ اور ان درختوں کے نیچے اونٹوں کی مینگنیاں بکھری ہوئی تھیں ـــ ہر جھونپڑی دو منزلہ تھی ـــ لیکن ان دو منزلوں کی مجموعی اونچائی بیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی ـــ سیڑھی کوئی بھی استعمال نہ کرتا تھا۔ یہ لوگ رسوں کی مدد سے دوسری منزل پر پہنچتے تھے ـــ یہ ڈھوک لالہ قبیلے کی ملکیت تھی جس کی شاخیں پورے صحرائے مروٹ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ شاید بیکانیر

میں بھی اس قبیلے کے ایک دو خاندان آباد تھے۔۔۔

وہ گلی میں سے جلدی جلدی گزرتا ہوا پہلے سرے پر ایک جھونپڑی کے قریب جا کر رک گیا۔۔۔ یہ جھونپڑی دوسری جھونپڑیوں سے قدرے نمایاں تھی، کہ اس کے سرکنڈے کے دروازوں پر آک کے کاسنی پھولوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔۔۔ یہ اس کی باجو کی جھونپڑی تھی۔۔۔ کاکڑا بھی یہیں رہتا تھا۔۔۔ اس کا اصلی نام کسی کو معلوم نہ تھا۔۔۔ وہ صرف سردار کے ذہن میں محفوظ تھا۔۔۔ اور سردار کا کہنا تھا کہ اگر چالیس برس کی عمر سے پہلے اس کا اصلی نام بتا دیا گیا، تو لڑکی کی موت واقع ہو جائے گی ۔۔۔ یہ معاملہ صرف اس کی باجو کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ قبیلے کی ہر لڑکی چالیس برس کی عمر تک اپنے نام سے محروم رہتی تھی۔۔۔ بہر حال سب لوگ اسے لالی کہہ کر پکارتے تھے۔۔۔

جھونپڑی کے نزدیک پہنچ کر اس نے لالی کو آواز دی۔۔۔ جواب میں اوپر کی منزل سے ایک رسہ نیچے لٹک آیا۔۔۔ اس نے رائفل کو اپنے کندھے پر درست کر کے لٹکایا، بچوں کے ہجوم کو ڈرا دھمکا کر منتشر کیا اور رسے کی مدد سے اوپر چڑھنے لگا۔۔۔ تمام عورتیں اپنی اپنی جھونپڑیوں کے اندر چلی گئی تھیں، اور دروازوں کی جھریوں سے چوری چوری باہر جھانک رہی تھیں۔

اوپر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سورج ڈوب رہا ہے۔۔۔ اور آسمان پر

لالیاں پھیل گئی ہیں ۔۔۔ تب ان افق تا افق بکھری ہوئی سرخیوں کو دیکھ کر اُسے اپنی زندگی کا محدود پن یاد آیا ۔۔۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی ساری زندگی اس صحرا کی وسعت میں ڈبو دے ۔۔۔ اور یہاں کی بہاروں اور خزاؤں سے لپٹ کر ہنستا اور روتا رہے ۔۔۔ لیکن اس کے لئے اب اُس میں ہمّت نہ رہی تھی ۔۔۔ دو سال کا عرصہ کچھ کم طویل نہیں ہوتا ۔۔۔ اس پر وہ اُداس ہو کر اپنی باجو کے متعلق سوچنے لگا ۔۔۔ لالی جو پہلے پہل اس کے لئے ہاضمے کی گولی سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ کہ کھالی تو معدہ ذرا ہلکا ہلکا سا محسوس ہونے لگا، نہ کھائی تو بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا لیکن پھر ۔۔۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ۔۔۔ ایسی کالی راتیں بھی آئیں، جب اُسے اپنے جسم میں آگ کے الاؤ بھڑکتے محسوس ہوئے اور وہ ان راتوں کے تنہا تنہا لمحوں میں لالی کی دراز پلکوں کے ایک جھپکاؤ، اس کی لمبی لمبی ابریشمی انگلیوں کے ایک لمس، اس کے رس بھرے ہونٹوں کے ایک بوسے، اس کی چھاتی چھاتیوں کی ایک ہلکی سی لرزش اور اس کی گول گوں چکنی باہوں کے ایک نامعلوم سے دباؤ کے لئے ترستا رہا ۔۔۔ لالی کے لیے اس کے جذبات میں گرمی آتی گئی ۔۔۔ ڈاکٹری کی ساری سائنٹیفک تھیوریاں پیچھے رہ گئیں ۔۔۔ اور جذبات کی یہ گرمی ایک انجانے سے روحانی رشتے کی ڈور بن گئی ۔۔۔ جس میں وہ اور لالی بندھے ہوئے تھے ۔۔۔ تب اُسے ناز و نیاز محبت

اور انتظارِ عشق کی گہرائیوں اور طوالتوں سے آگاہی حاصل ہوئی — اور اس لئے جب وہ لالی سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کو ملنے آیا — تو اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ اپنے جسم کے ایک ایسے عضو کو آپریشن کر کے الگ کر رہا ہو، جو زندگی کی ساری توانائیوں، دل کی تمام محبتوں، نگاہ کی ساری تابانیوں اور ایک نازک جذبے کی تمام تب و تاب کا مرکز ہے۔

وہ ایک بار پھر اندر سے پکارا — "لالی" —

"میں یہاں ہوں ڈاکدار — اِدھر آجاؤ" صحرا کی گھمبیرتا میں گھنٹیاں سی بج اُٹھیں۔

اس نے اوپر پہنچ کر رسہ کھینچ لیا اور ٹاٹ کے ایک بوسیدہ سے پردے کو ہٹا کر اندر داخل ہو گیا — اندر اندھیرا تھا وہ کسی جانور سے اُلجھ کر گرتے گرتے بچا — جانور چیاؤں چیاؤں کرتا، تاریکی میں ایک طرف کو کھسک گیا۔

لالی نے کہا — "گیدڑ تھا" — پھر ذرا رُک کر کہنے لگی — "تم ذرا صبح تک ٹھہرو گے نا؟ —"

اندھیرے کی وجہ سے وہ اُسے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن آواز میں کچھ ایسا جادو تھا کہ اُس کے بدن کے سارے تار جھنجنا اُٹھے اور وہ دیر تک کوئی جواب نہ دے سکا — !

تب اس نے کہا — "نہیں — میرا خیال ہے کہ نہیں"

تاریکی سے اس کی نظریں ابھی تک مانوس نہ ہوئی تھیں ــــ اور اسے کلبلاتے ہوئے زرد زرد آنکھوں والے گیدڑوں کے بچوں کے سوا کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا ــــ یہ بچے چیاؤں چیاؤں کرتے فرش پر رینگ رہے تھے، اور ان کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ یہ لالی کی گیدڑی کی آوارگی کے نئے نتائج تھے ــ پھر اس نے چرخ چوں چرخ کی آواز سُنی ــــ یہ چھت سے لٹکے ہوئے جھُولے کے جھُولنے کی آواز تھی ــــ جس میں لالی کا نوزائیدہ بچہ سو رہا تھا ــــ یہ لوگ بچّوں کے جھُولے چھتوں پر لٹکاتے تھے تاکہ بچہ صحرائی چوہوں اور کوڑ کرلیوں (چھپکلیوں) کی زد سے محفوظ رہے ــــ تب آخر کار اُسے لالی کا صندلیں بازو نظر آیا، جو جھولے کو آہستہ آہستہ ہلکورے دے رہا تھا ــــ آبنوسی جسم پر لباس واجبی واجبی تھا گیدڑ کی کھال کی ایک دھوتی رانوں کے ارد گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے خطوط، گداز پیٹ کی صحت مند چربیں اور سینے کے مدوّر زاویئے، باہم بڑے پُراسرار انداز میں مدغم ہو رہے تھے ــــ چھدے ہوئے کانوں میں لوہے کے بُندے تھے ــــ اور ناک میں کانسی کی ایک بڑی سی لونگ تھی ــــ

ڈاکٹر نے کہا ــــ "میں تمھارے پاس زیادہ دیر تک ٹھہرتا لالی! مگر ......" وہ ایک لحظے کے لیے رکا جیسے اپنی آواز میں جذبات کی

لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ "مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔"

لالی کہنے لگی — "ذرا ٹھہرو — میں نہا آؤں —"

اور اس نے جھولے کو ذرا زور کا ہلکورا دیا، مُڑی اور رسّہ پھینک کر نیچے اتر گئی — ڈاکٹر چپ چاپ کھڑا زرد زرد آنکھوں والے گیدڑ کے بچوں کو دیکھتا رہا — "شاید تم سمجھتے ہو کہ لالی تم پر بہت مہربان ہے" — اُس نے اونچی آواز میں کلبلاتے ہوئے بچّوں کو مخاطب کیا۔ "لیکن جب ذرا بڑے ہو جاؤ گے تو معلوم ہو گا کہ یہ ساری مہربانیاں اس لئے ہیں کہ تمھیں مٹّی کی ہنڈیا میں بھونا جا سکے — سمجھے" — اس نے رائفل کو کندھے سے اُتار کر دیوار کے ساتھ لگا یا اور خود بھی دیوار کی ٹیک لگا کر کچّے فرش پر بیٹھ گیا۔

وہ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد واپس آئی — یہ اس کا معمول تھا، جب بھی ڈاکٹر اس سے ملنے آتا تو اس سے ملنے سے قبل وہ لالہ ڈھوک کے ٹوبے میں — پانی کی بلاؤں سے خوفزدہ ہونے کے باوجود — غسل کرتی تھی — اور واپسی میں، ڈھوک کے عین درمیان سے فحش گیت گنگناتے ہوئے گزرتی تھی — اور واپس آ کر، اپنے چہرے پر محبت کا وہ رنگ ملتی تھی، جو اس صحرا کی نئی بیاہتا عورتیں سہاگ رات میں ملتی ہیں —

یہ رنگ نہ جانے یہ لوگ کس طرح تیار کرتے تھے کہ اس کو چہرے پر ملنے کے بعد بدڈھب سے بدڈھب لڑکی میں بھی بے پناہ جنسی کشش پیدا ہو جاتی تھی ــــ لالی کا جسم تو یوں بھی ایک آگ تھا، یہ رنگ ملنے کے بعد ایک بھڑکتا الاؤ بن جاتا تھا ــــ اور جب ڈاکٹر علی الصبح ڈسپنسری جاتا تو اس کے بدن کے مختلف حصوں پر اس رنگ کے داغ ہوتے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "لالی میری بات سنو"۔

لالی نے اپنا مسکراتا ہوا چہرہ ڈاکٹر کی طرف موڑ دیا۔ "کہو"۔

"میں نے یہاں سے واپس کسی بڑے شہر میں چلے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔

لالی فوراً اٹھ کر جھولے کو ہلکورے دینے لگی ــــ اور اس کے چہرے پر لازوال نسائی غرور کی پرچھائیاں اُبھر آئیں ــــ گیدڑ کے سوئے ہوئے بچے، پھر کلبلانے لگے ــ ڈاکٹر نے سگریٹ سلگا لیا اور وہ خاموشی سے اس کے قریب آ بیٹھی ــــ پھر بہت ہی مدھم آواز میں کہنے لگی ــــ

"جب تم پہلے پہل یہاں آئے تھے، تو میں برباد ہو گئی تھی"۔

"کیوں ــــ؟"

"میں تم سے نفرت کرتی تھی"۔

"میں سمجھتا ہوں ــــ"

"تم نہیں سمجھتے ــــ تم نہیں سمجھ سکتے ــــ"

"اچھا تو پھر بتاؤ ——"

"میں تم سے نفرت کرتی تھی، چونکہ جب تم آئے تھے تو میرے خاوند کو مرے صرف چودہ دن گذرے تھے —— صرف چودہ دن —— اور اُن دنوں میرے پیٹ میں اس کا بچّہ تھا ——"

"مجھے معلوم ہے"۔

"نہیں تمہیں نہیں معلوم —— تم سے محبّت کر کے میں نے اُسے ایک بار اَور مار دیا —— ہمارے ہاں لوگ دو دفعہ مرتے ہیں —— پہلی دفعہ ان کا جسم مرتا ہے دوسری دفعہ ان کی رُوح —— اس کے جسم کو ایک درخت نے مارا تھا، میں نے اس کی روح کو مار دیا"۔

"تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں"۔ ڈاکٹر نے کہا ——

"نہیں —— جس کا تم سے کوئی تعلق نہ ہو، تم اسے قتل نہیں کر سکتے —— مار نہیں سکتے ——"

ڈاکٹر —— لالی کے خیالات کی نزاکت اور باریکی پر مسلسل حیران ہو رہا تھا —— لالی کا ذہن، احساسات کی وہ پراسرار مملکت تھا جس کی اس نے آج تک سَیر نہ کی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں وحشی سرخ ڈورے لہرانے لگے ——،

لالی نے مست ناگن کی طرح ایک بل کھایا —— ڈاکٹر نے جذبات سے

بے قابو ہو کر اس کی کلائی تھام لی اور اس کا تنا ہوا آبنوسی جسم اس کی آغوش میں آ گرا۔۔۔ اس کا جسم اب تک نم آلود تھا، اور اس کے بھیگے ہوئے بالوں میں ٹوبے کے پانی کی مہک تھی۔

"میں واپس جا رہا ہوں لالی"۔۔۔ ڈاکٹر نے اس کے جسم کو بھینچتے ہوئے کہا۔

"جھوٹے"۔

"میں نے کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولا"۔

"یہ بھی جھوٹ"۔۔۔

"نہیں۔ بالکل سچ"۔۔۔

"یاد ہے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جب جاؤ گے مجھے بتا کر جاؤ گے"۔

"ہاں۔۔۔ بتا تو رہا ہوں تمہیں"۔۔۔

"غلط۔۔۔ تم جانے کے بعد مجھے بتا رہے ہو۔۔۔ تم تو جا چکے ہو۔۔۔ صرف تمہارے کپڑے یہاں ہیں۔۔۔ جو باتیں کر رہے ہیں۔۔۔ تم یہاں نہیں ہو۔۔۔ تم جا چکے ہو۔۔۔" یہ کہہ کر لالی ڈاکٹر کے بال نوچنے لگی۔

ڈاکٹر نے کہا۔۔۔ "پاگل نہ بنو لالی!۔۔۔ تمہارا نام کتنا پیارا ہے۔۔۔ کس قدر خوبصورت ہے۔۔۔"

"اچھا تو پھر نہ جاؤ"۔۔۔

"نہیں۔۔۔ یہ ناممکن ہے"۔۔۔

میں تمہیں قتل کر دوں گی ــ زہر دے کر مار دوں گی ــ اور تمہاری نعش کو زندگی بھر اپنے ساتھ چمٹائے رکھوں گی۔"

ڈاکٹر نے سر اٹھا کر لالی کی طرف دیکھا ــ اس کی آنکھوں میں خون کی سرخی تھی ــ اس کا بدن حدت سے تپ رہا تھا۔ ڈاکٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے چاروں طرف شعلے ناچ رہے ہوں، وہ اٹھ کھڑا ہوا ــ اور لالی کا چہرہ، اپنی ہتھیلیوں میں تھام کر کہنے لگا ــ "تم مجھے بہت پیاری ہو لالی ــ میں لاہور سے تمہیں اچھے اچھے تحفے بھیجا کروں گا۔"

لالی نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا چہرہ اس کی نرم گرفت سے چھڑا لیا اور جلدی سے رسہ پھینک کر نیچے ڈھوک میں اتر گئی ــ ڈاکٹر کھڑا کا کھڑا رہ گیا ــ اس کا جسم سرد ہو رہا تھا اور ذہن میں برف جم رہی تھی ــ کسی پیارے کو ــ جس سے آدمی جسمانی اور روحانی تعلق محسوس کرے ــ جس سے ناز و نیازِ محبت اور انتظارِ عشق کی گہرائیوں اور طوالتوں سے آگاہی بخشی ہو ــ الوداع کہنا بڑا مشکل ہے ــ ڈاکٹر نے بے حد اداس ہو کر سوچا ــ ہر جدائی ایک چھوٹی موت ہے اور موت کبھی قابلِ یقین نہیں ہوتی ــ اس کو تسلیم کرنے کو دل نہیں چاہتا ــ ڈاکٹر نے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر باہر جھانکا ــ ہلکا ہلکا اندھیرا چاروں طرف دبے قدموں پھیل رہا تھا ــ صحرائی جھینگر بڑے غمناک سُروں میں جھنجھنا رہے

تھے ـــــ اس نے جھولے میں سوتے ہوئے بچے کی بند آنکھوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا لیکن وہ گہری نیند سو رہا تھا، جیسے جھولے میں نہیں بلکہ اپنی ماں کی گود میں ہو ـــــ بستی کے مرد، شاید ابھی تک لکڑیاں کاٹ کر نہ لوٹے تھے ـــــ ڈھوک سنسان پڑی تھی ـــــ اور وہ ٹاٹ کا پردہ اٹھائے اس گھمبیر سناٹے میں دُور افق پر جھلملاتے ہوئے، جاگتے ہوئے رات کے پہلے ستارے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا ـــــ گلی میں دائیں جانب عورتوں اور بچوں کا باہم سرگوشیاں کرتا ہوا ہجوم کھڑا تھا ـــــ ڈاکٹر نے رسہ لٹکایا اور گلی میں اُتر کر اس ہجوم کے قریب چلا گیا ـــــ ہجوم کے عین درمیان ایک عورت، جس کا چہرہ رنگا ہوا تھا، یوں وارفتگی کے ساتھ چکر کھا رہی تھی، جیسے پاگل ہو گئی ہو ـــــ ڈاکٹر کو اُسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی ـــــ وہ لالی تھی ـــــ وہ بگولے کی طرح چکر کھا رہی تھی ـــــ معاً ایک آٹھ نو برس کا لڑکا دوڑا دوڑا گیا، اور پیتل کی ایک بڑی سی ٹوٹی پھوٹی ہنڈیا لے آیا ـــــ اور کیکر کی چھڑی سے اس پر ایک عجیب و غریب تال دینے لگا ـــــ اور لالی زیادہ پاگل ہوتی گئی۔

یکایک ہجوم میں سے کسی عورت نے اُسے پہچان لیا اور ایک ذرا طنزیہ لہجے میں کہنے لگی ـــــ "ڈاکدار بیر ـــــ ڈاکدار بیر" ـــــ سب اس کی طرف دیکھنے لگے ـــــ ان کی نظروں میں ایک طنز تھی ـــــ نفرت تھی ـــــ

اور لالی یوں رقصاں تھی — جیسے زخمی کونج ہوا میں پھڑپھڑا رہی ہو — وہ ناچتی رہی — ناچتی رہی — زیادہ سے زیادہ جنون و دارفتگی کے ساتھ، حتیٰ کہ لڑکھڑا کر گر پڑی —

کسی نے اُسے تھامنے کی کوشش نہ کی — وہ خاک پر پڑی پیاسی مچھلی کی طرح تڑپتی رہی اور چلا چلا کر کہتی رہی — "ڈاکدار مر گیا ہے — ڈاکدار مر گیا ہے —"

تھوڑی دیر بعد وہ گھٹنوں کے بل اُٹھی اور اپنے بالوں میں خاک ڈالنے لگی — اور ناخنوں سے اپنا بدن چھیلنے لگی — اس کے حلق سے بڑی عجیب و غریب بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں، جیسے عالمِ نزع میں ہو — سارے ہجوم نے چلا چلا کر آسمان سر پہ اٹھا لیا — "ڈاکدار پیر مر گیا ہے — ڈاکدار پیر مر گیا ہے —"

ڈاکٹر ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور لالی کا بازو تھام کر کہنے لگا، "میں ساری عمر تمھیں یاد رکھوں گا — لالی کا جسم مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ ننگی چھاتیوں پر ناخنوں کی خراشیں تھیں" — اور محبت کے رنگ پر آنسو دل کے داغ تھے — اس نے جلدی سے اپنا بازو ڈاکٹر کی گرفت سے چھڑا لیا — اور اپنے تیز ناخنوں سے ڈاکٹر کا منہ نوچنے لگی —

ڈاکٹر خاموش تھا — پتھر کے بُت کی مانند بے حس و حرکت —

(۳)

بہار اپنے پورے جوبن پر تھی ـــــ صحرا خودرَو پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا ـــــ ڈسپنسری کے اردگرد، کریر کی جھاڑیوں نے سُرخ شگوفوں کے دوشالے اوڑھ لیے تھے ـــــ

ڈاکٹر، فورٹ عباس سے، ہفتے کے ہفتے آنے والی جیپ کا انتظار کر رہا تھا ـــــ اتوار گذر گئی تھی، لیکن جیپ ابھی، نہ آئی تھی ـــــ لیکن موسم چونکہ بہت پیارا ہو رہا تھا، اس لیے ڈاکٹر بہت زیادہ فکرمند نہیں تھا ـــــ وہ ان دنوں کو بے حد صحت مند اور ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا ـــــ پوری نیند سوتا اور ڈٹ کر کھاتا ـــــ لسے اس بات سے بھی جھنجھلاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی، کہ وہ جس طرف بھی جاتا ہے، لوگ اسے غیر معمولی طور پر گھور گھور کر دیکھتے ہیں ـــــ جیسے وہ کوئی چور ہو، اور اُن کی کوئی چیز چرا کر بھاگنے والا ہو۔

جب وہ ڈسپنسری میں ہوتا، تو کھڑکیوں اور دروازے میں سے کئی آنکھیں اس پر مرکوز ہوتیں ـــــ رات کو سونے لگتا، تو قریب کی جھاڑیوں میں سے کئی سر اُبھر اُبھر کر اس کو دیکھتے ـــــ

اتوار گذرے تین دن ہو چکے تھے اور جیپ اب تک نہ آئی تھی۔

ایک دن وہ صبح سو کر اٹھا، تو اُسے یوں محسوس ہوا، جیسے تمام رات اس کا جسم بخار میں بھُنتا رہا ہو ـــــ اس نے تھرمامیٹر لگا کر دیکھا، تو اس وقت اسے ۱۰۲ درجے بخار تھا ـــــ اس کی آنکھوں میں جانو

آگ جل رہی تھی ــــ وہ دوبارہ دھم سے بستر پر گر گیا ــــ اور غنودگی کے عالم میں کاکرڑے کو آوازیں دینے لگا ــــ لیکن ان دنوں کا کرڑا نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ــــ دن ڈھل گیا اور وہ بے ہوش بستر پر پڑا رہا ــــ اگلے دن علی الصبح اس کی آنکھ جیپ کی گڑگڑاہٹ سے کھلی ــــ بخار بھی کچھ ہلکا ہو گیا تھا ــــ

"میرا سارا سامان جیپ میں رکھ دو" ــــ اس نے ڈرائیور کے سلام کا جواب دیئے بغیر تحکمانہ لہجے میں کہا ــــ اور خود جیپ میں آبیٹھا ــــ

ڈرائیور نے سامان جیپ میں رکھ دیا اور انجن سٹارٹ کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ فورٹ عباس کی طرف جا رہے تھے ــــ ڈاکٹر پچھلی سیٹ پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا ــــ

وہ جا رہا تھا ــــ ساڑھے چار سال بعد اس صحرا سے روانہ ہو رہا تھا ــــ لالی، کاکرڑا، لالہ ڈھوک، ڈسپنسری کریر کی جھاڑیاں اور کیکر کے درخت ــــ یہ سب پیچھے رہے جا رہے تھے ــــ یہاں اُسے کیا نہ ملا تھا ــــ عزّت، شہرت، محبّت ــــ انھوں نے اسے دیوتا بنا کر پوجا تھا ــــ اپنے سرداروں سے زیادہ اس کی حکم برداری کی تھی، ــــ اور اب وہ جا رہا تھا ــــ ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ــــ دوڑتی ہوئی جیپ ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی اور کئی آدمیوں کا دھیما دھیما سا شور اس کے کانوں سے ٹکرایا ــــ اس نے آنکھیں کھول کر ڈرائیور سے پوچھا۔

"کیا بات ہے ــــ؟"

"جانگلیوں نے راستہ روک لیا ہے" ڈرائیور نے فکرمندی سے کہا۔
اُس نے سر اٹھاکر باہر دیکھا، ___ انھوں نے جیپ کو گھیر رکھا تھا ___ اور دیوانہ وار رقص کر رہے تھے ___ مرد، عورتیں، بچے سب پاگلوں کی طرح ناچ رہے تھے ___ ان کے ہاتھوں میں کریر کے سُرخ شگوفوں کے گچھے تھے ___ جن کو وہ ہوا میں لہرا رہے تھے، اور مُنہ سے "ہی ___ ہا ___ شوُ ___ شوُ ___ ہی ___ ہا" کی آوازیں نکال رہے تھے ___ عقب میں لالہ ڈھوک کی جاپانی پگوڈوں ایسی دو منزلہ جھونپڑیاں تھیں ___ اور ڈرائیور انھیں زیر لب ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا۔
"ڈرائیور جیپ چلاؤ" ___ اس نے چیخ کر کہا ___
"ان ماں کے یاروں نے گھیرا ڈال رکھا ہے جی" ___ ڈرائیور نے جھنجلا کر کہا ___
کچھ دیر اسی طرح جیپ کے ارد گرد ناچنے کے بعد وہ پیچھے ہٹ گئے اور ایک قطار میں کھڑے ہو گئے ___ جیپ چل پڑی ___ ڈاکٹر نے پیچھے مڑکر دیکھا، وہ اُسی طرح ایک قطار میں کھڑے تھے ___ انھوں نے کریر کے سُرخ شگوفے ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے ___ اس طرح ہوا میں ایک سُرخ زنجیر سی بن گئی تھی ___ ہر شگوفہ اس زنجیر کا ایک حلقہ تھا ___ یکایک زنجیر ٹوٹ گئی، ایک عورت قطار سے باہر نکل آئی، ___ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ مسلسل شگوفوں کو ہوا میں لہرا رہی تھی ___ ڈاکٹر نے غور سے دیکھا ___ یہ لالی تھی ___ اس کے ساتھ

ایک مرد بھی قطار سے باہر نکل آیا اور ہوا میں زور زور سے سُرخ شگوفے لہرانے لگا۔ یہ کاکرٹا تھا ــــ اس کا دوست ــــ اس کا ساتھی ۔ اس کی باجُو کا تایازاد بھائی ــــ جسے انجکشن لگانے کی ڈاکٹر سے بھی زیادہ مشق ہو گئی تھی ــــ جو ٹینس میں اُسے ہرا دیتا تھا ــــ

جیپ دوڑتی رہی ــــ ٹوٹی ہوئی زنجیر ہوا میں معلق رہی ــــ لہراتے ہوئے ہاتھ دور ہوتے چلے گئے ــــ لاآی اور کاکرٹا کے سُرخ شگوفے موہوم نقطے بن گئے ــــ اور ڈاکٹر کے کانوں میں ایک بہت ہی مدھم سی آواز آئی ــــ شاید کاکرٹا وہاں کھڑا، شگوفے لہراتے ہوئے زور زور سے گانے لگا تھا ــــ

میرے ہونٹ ناگن کے ایسے سُرخ ہیں
میں چھنیر ناگن کی طرح بل کھاتی ہوں
تم میرے نزدیک، .........

---

# میری لائبریری کا سلسلۂ تاریخ و سوانح

**ابوبکر صدیق اکبرؓ** محمد حسین ہیکل۔ مترجم محمد احمد پانی پتی۔ صدیق اکبر کے مقام و مرتبہ، عظمت و شوکت، سوز و گداز اور یقین و ایمان کا پہلا شایانِ شان تذکرہ۔

میری لائبریری: چھ روپے — سفید کاغذ مجلد دس روپے

**عمر فاروقِ اعظمؓ** محمد حسین ہیکل۔ مترجم حبیب اشعر۔ یہ کتاب حضرت عمرؓ کی شخصیت اور کارناموں کی چہرہ کشائی میں بے نظیر ہے۔ (روزنامہ جنگ، کراچی)

میری لائبریری: بارہ روپے — سفید کاغذ مجلد بیس روپے

**دس بڑے مسلمان۔** محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ ابوبکرؓ کی رفاقت عمرؓ کے عدل عثمانؓ کی طہارت علی کرم اللہ وجہہ کے علم خدیجہؓ کے خلوص عائشہؓ کے ایثار ابوعبیدہؓ کی شجاعت معاویہؓ کی فراست، حسینؓ کی صداقت کی نظیر تاریخِ اسلام ہی میں نہیں تاریخِ انسانیت میں بھی ناپید ہے۔ ان ہستیوں کی زندگی اور کردار پر ایک کامیاب کتاب۔

میری لائبریری: چار روپے — سفید کاغذ مجلد آٹھ روپے

**الحسینؓ** عمر ابوالنصر، مترجم محمد احمد پانی پتی۔ الحسین کے مطالعے سے حضرت حسینؓ کی شخصیت، عظمت اور واقعۂ کربلا کی اہمیت و صداقت دل میں گھر کر لیتی ہے۔

میری لائبریری: ڈیڑھ روپیہ — سفید کاغذ مجلد تین روپے پچاس پیسے

**الزہراؓ** عمر ابوالنصر، محمد احمد پانی پتی۔ مصنف نے خاتونِ جنت کے عادات و خصائل کا نقشہ اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ بی بی فاطمہ کی جیتی جاگتی شخصیت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

میری لائبریری: سوا روپیہ — مجلد دو روپے پچاس پیسے

**الہارون** عمر ابوالنصر، محمد احمد پانی پتی۔ ہارون، تدبّر، اولوالعزمی، علم دوستی اور غریب نوازی کے لحاظ سے تاریخِ عالم کا سنہری باب ہے۔

میری لائبریری: سوا دو روپے — سفید کاغذ مجلد چھ روپے

**خالد سیف اللہ** ابو زید شلبی، محمد احمد پانی پتی۔ خدا کی تلوار خالد سیف اللہ پر یہ کتاب حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔
میری لائبریری : پونے تین روپے مجلد چھ روپے

**امام زین العابدین علی بن حسین** عبدالعزیز سید لاحل مترجم پروفیسر عبدالصمد صارم، انسانیت کے اُس عظیم پیکر کی حیات پر پہلی کتاب مختصر مگر مفصل۔
میری لائبریری : ایک روپیہ پچیس پیسے مجلد دو روپے پچیس پیسے

**ابُوذر غفاری رض** عبدالحمید جودۃ السحارہ۔ مترجم عبدالصمد صارم ہمارے نبیؐ کے محبوب صحابی کے حالات جو یہ چاہتے تھے کہ مسلمان متاعِ دنیا کو اپنا خدا نہ بنالیں۔
میری لائبریری : دو روپے سادہ کاغذ مجلد تین روپے

**عمر بن عبدالعزیز رح** احمد زکی صفوت مترجم عبدالصمد صارم، اُس عظیم و جلیل فرزند کے حالات جس نے خلفائے راشدہ کی یاد تازہ کردی تھی۔
میری لائبریری : ایک روپیہ پچیس پیسے مجلد دو روپے پچیس پیسے

**امیر معاویہ رض** انیس زکریا مترجم عبدالصمد صارم، سلطنت بنو امیہ کے بانی کی سیاست و حکومت کا منصفانہ جائزہ۔
میری لائبریری : ایک روپیہ پچیس پیسے مجلد دو روپے پچیس پیسے

**شیخ عبدالقادر جیلانی** حکیم غلام حیدر سہیل۔ شیخ کی زندگی ان کے عہد کے حالات و واقعات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ بے حد دلچسپ، دلنشیں۔
میری لائبریری : ایک روپیہ پچاس پیسے مجلد چار روپے

**تذکرہ :۔** ابوالکلام آزاد۔ باطل کے خلاف حق کا جہاد۔ اسلاف کے کارنامے۔
میری لائبریری : پونے چار روپے سفید کاغذ مجلد سات روپے

**سلطان محمد فاتح۔** محمد مصطفٰے صفوت۔ مترجم عبدالصمد صارم۔ ایک زبردست مسلمان فاتح کے معرکوں پر نہایت

اعلیٰ کتاب جو بڑے سادہ لیکن موثر انداز سے سلطان کی دلچسپ اور حیات پرور کہانی سناتی ہے

میری لائبریری : ڈیڑھ روپیہ مجلد دو روپے پچاس پیسے

**سُلطانی محلوں کے راز** جمال پاشا الغزی۔ مترجم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی گئی مگر صرف اردو زبان میں چھپی کہ ترکی میں چھپ نہ سکتی تھی۔

میری لائبریری : پونے چار روپے سفید کاغذ مجلد سات روپے

**رُوپ متی** فیاض حسین ہندوستان کی جلیل و جمیل خاتون کے حالات مصنف نے سطر سطر میں پھول کھلائے ہیں۔

بیحد پیاری زبان میری لائبریری : اڑھائی روپے سفید کاغذ مجلد چھ روپے

**قلوپطرہ** آرتھر ویگل۔ مترجم پروفیسر ناظر حسن زیدی، ملکۂ مصر مجسمہ جلال و جمال کی رنگین و سنگین زندگی کا حقیقت آفریں جائزہ، ترجمے میں بھی انگریزی کی سی سلاست موجود ہے۔

میری لائبریری : پونے چار روپے سفید کاغذ مجلد سات روپے

**رابعہ بصری** وداد السکاکینی مترجم عبدالصمد صارم۔ مشہور عاشقِ الٰہی خاتون کی زندگی کے حالات و واقعات۔ تاریخ و تذکرہ میں ایک نادر کتاب۔ تصوف کا تحفہ۔

میری لائبریری : ڈیڑھ روپیہ مجلد تین روپے پچاس پیسے

**مانیں نہ مانیں** ڈیل کارنیگی۔ مترجم جاوید شاہین۔ کارنیگی نے بڑی دلچسپ شخصیتوں کے حالات مرتب کئے تھے اور ترجمہ بھی بڑا دلچسپ اور پسندیدہ ہے۔

میری لائبریری : ڈھائی روپے مصور ایڈیشن سفید کاغذ مجلد چھ روپے

**۳۹ بڑے آدمی** ڈیل کارنیگی، مترجم جاوید شاہین۔ واقعی بڑے آدمی جن کا نام صدیوں تک زندہ رہے گا، ان کے بڑے ہونے کا راز کیا تھا؟ پڑھنے والی کتاب۔

میری لائبریری : پونے چار روپے مجلد سفید کاغذ آٹھ روپے

**کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں** ڈیل کارنیگی، مترجم جاوید شاہین، ظفر عامر۔ واقعی دلچسپ باتیں جن سے ہم لطف بھی لے سکتے ہیں سبق بھی۔

میری لائبریری : پونے چار روپے سفید کاغذ مجلد آٹھ روپے

حالات زندگی اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کو خانیوال میں پیدا ہوا اور ہارون آباد میں — کہ اک شہر ہے خیالوں کا — پروان چڑھا — زندگی مختصر کی جو صبحیں، شامیں اور ساعتیں، اس دیار میں گذاریں، ان کو سرمایہ جاں سمجھ کر سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔

زندگی بھر کی کمائی چند آنسو، کچھ کہانیاں اور چار دوست — راؤ مختار احمد، منور عمر، ناصر زیدی اور یوسف اختر صدیقی — ہیں۔ ہمیشہ طوفانوں کا همرکاب رہا، حادثوں سے رہ و رسم آشنائی بڑھائی اور معرکوں کی انگلی تھام کر چلا — اور اب تو پوری زندگی اس شعر کی تفسیر نظر آتی ہے ؎

کیسے کیسے حادثے تھے، کیسے کیسے معرکے
جو مرتّب ہو کے میری زندگانی بن گئے

آجکل ماہنامہ "ادب لطیف" کا مدیر ہوں۔ اور "خوبان ادب" کی "نخریلی" اداؤں کے تیر اپنے سینے پر کھا رہا ہوں۔

تصانیف :— دود چراغ محفل، (ناول) — درد آئے گا دبے پاؤں، (کہانیوں کا مجموعہ) — میری وادی، میرے پھول، (ناول، زیر تصنیف) — قافلے سحر کے، (ناول، زیر تصنیف) — راؤ فیاض، (ناول، زیر تصنیف) — روشنی کے آنچل، (کہانیوں کا دوسرا مجموعہ، زیر طبع) — کھلی آنکھ کا دکھ (کہانیوں کا تیسرا مجموعہ، زیر طبع) — 'The Free Slave' (ایک انگریزی ناول — نیو یارک میں زیر اشاعت) علاوہ ازیں کئی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ انگریزی کہانیاں، ایک طویل انگریزی ڈرامہ — اردو میں، ٹیلیویژن کے لئے چند ڈرامے —!

مشاغل :— کتابیں خریدنا اور پڑھنا —!